

رجب • شعبان • رمضان ۱۹
اکتوبر • نومبر • دسمبر ۹۸

صفا

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، دعوتی، اصلاحی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

رجب • شعبان • رمضان ۱۴۱۹ھ
اکتوبر • نومبر • دسمبر ۱۹۹۸ء
شمارہ: ۲۹

مدیر اعلیٰ
محمد رضوان القاسمی

مدیر مسؤل
بدر الحسن قاسمی

مدیر تحریر
خالد سیف اللہ رحمانی

معاونین
سرفراز احمد قاسمی ○ احمد عبد المجیب قاسمی ندوی
اشرف علی قاسمی

سالانہ Rs. 80/- • معاون خصوصی Rs. 500/-

فی شمارہ Rs. 25/-

انتخاب

"اخلاقی برتری کے لئے مکارمِ اخلاق کی تعلیم اور ماحول کی سازگاری کی جدوجہد کے ساتھ تربیت ضروری ہے، اگر اس تعلیم و تربیت کے باوجود بھی انسانی زندگی کے صحیح نتائج مرتب نہ ہوں تو اس تعلیم و تربیت کو ہدفِ طعن بنانے سے زبانِ خلق کو روکا نہیں جا سکتا لیکن اگر نا قابلِ انکار واقعاتی رنگ میں ان کے صحیح نتائج سامنے آجائیں تو سلیم الطبع طبقات میں ان کی قطعی عظمت اور انسانیت کے لئے ان کی عظیم افادیت کا اعتراف پیدا ہو جانا بھی ایک فطری اور یقینی امر ہوتا ہے۔

اس ذیل میں یہاں یہ واضح رہے کہ اسلامی کتب خانہ میں ایسی کتابیں جن میں مختلف انداز اور مختلف اسلوب اور پیرایے میں تاریخ اسلام کے جن نا قابل فراموش اور مثالی واقعات کا تذکرہ موجود ہے، ان کے مطالعہ سے بلا شبہ فکری و ذہنی تربیت میں مدد ملے گی، اور مطالعہ نگار کے اخلاق و کردار میں پختگی اور تعمیر و سیرت میں مضبوطی پیدا ہوگی، اسلئے اساتذہ طلبہ اور عام انسان کو اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ شب و روز کی مصروفیات میں شامل رکھنا چاہیئے۔

انسانیت کی ہمہ جہتی ترتیبی ارتقاء پر مشتمل اسلامی تعلیمات، قربانی و ایثار، حق پسندی، راہِ حق میں مصائب پر خوش دلی، غریبوں پر شفقت و کرم، محبت و عداوت میں للّٰہیت، دشمنوں سے حسنِ سلوک، حقوق شناسی اور حسنِ ادائیگی، بدعہدی سے اجتناب اور وفائے عہد کا اہتمام، خلافت میں، امارت میں عنصر دیانت، اطاعتِ امیر اور اختلاف کی گنجائش، ادائے فرض پر ذاتی راحت و آرام کی قربانی، امیر پر ہر شخص کو آزادانہ محاسبہ کا حق، عظمتِ دینی رکھنے والے افراد و مقامات کا احترام، انسانی حریتِ ذات اور حریتِ فکری کا احترام و لحاظ، آئین و دیانت میں اپنوں اور غیروں میں یکسانیت، ہر شخص کے مذہبی جذبات کی عزت و حفاظت، تواضع و انکسار، اخلاق اور اخلاقیات کی حفاظت، حقوق اللہ کی اور حقوق العباد کی ادائیگی وغیرہ بڑوں اور بزرگوں کی زندگی کے یہ وہ اوصاف و کمالات ہیں جن کے تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ سے ایک انسان ان اوصاف و کمالات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، لیکن آجکل عام طور پر اس سے بے رخی اور بے نیازی برتی جا رہی ہے جس کی طرف فکر و اہتمام کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔"

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ

مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند

فہرست

افتتاحیہ

مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، اور اقتدار کی باگ ان کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو، بحیثیت مسلمان ان کیلئے اسلام کے اجتماعی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنا ضروری ہے۔ اسلام جس اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے اسی کا نام "امارت" ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور جماعت بغیر نظام امارت کے قائم نہیں ہوسکتی۔ اور امارت کی بنیاد معروف میں امیر کی رضا کارانہ اطاعت وفرمان برداری ہے۔ لااسلام الابجماعۃ ولا جماعۃ الابامارۃ ولاامارۃ الابطاعۃ۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مسلمانوں پر نظام امارت کو قائم کرنا واجب قرار دیا تھا چنانچہ امت کے دردمند اور بالغ نظر علماء نے ہر دور میں اپنی قوت اور صلاحیت کے مطابق اس نظام کو قائم کرنے کی کوشش فرمائی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ اس نظام شرعی کے قیام کیلئے بہت بے چین اور بے قرار تھے تاکہ مسلمانوں کی زندگی شرعی اصولوں کے مطابق گذر سکے اور کتاب وسنت کے دیئے گئے خطوط پر ان کی اجتماعی شیرازہ بندی عمل میں آئے، چنانچہ بالآخر مولانا کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۱۹۲۱ء میں بہار واڑیسہ میں امارت شرعیہ کا نظام قائم ہوا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے اور حالات بدلتے جاتے ہیں اس نظام کی اہمیت اور ضرورت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، چنانچہ آج پورے ملک میں اس حقیقت کو محسوس کیا جارہا ہے، اور مختلف ریاستوں میں امارت کا نظام قائم کیا گیا ہے، تاہم بہار واڑیسہ میں اس نظام کو جو استحکام اور رسوخ حاصل ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

چنانچہ امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد عارف باللہ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امیر شریعت خامس کی حیثیت سے منتخب ہوئے اور آپ کا مورخہ ۲۹/ستمبر ۱۹۹۸ء کو انتقال ہوگیا، آپ کا عہد امارت گو مختصر رہا لیکن مختلف وجوہ سے آپ کے عہد میں امارت نے بہت ترقی کی، اور بالخصوص تعلیم وتنظیم کے اعتبار سے امارت کو بڑی قوت و وسعت حاصل ہوئی، اس میں جہاں حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی قاضی شریعت اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب موجودہ امیر شریعت ۔۔ دامت برکاتہم ۔۔۔ کی فعال اور مخلصانہ قیادت کا دخل ہے، وہیں اس میں حضرت امیر خامس کا اپنے رفقاء پر بھرپور اعتماد اور اس کے ساتھ ان کی توجہ الی اللہ کی کیفیت بھی بڑی مؤثر رہی ہے۔

حضرت امیر شریعت خامس کے وصال کے بعد راقم الحروف نے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب مدظلہ نائب امیر شریعت (سابق) ناظم امارت شرعیہ کے نام جو تعزیتی خط (تحریر کردہ ۱۰/۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء) ارسال کیا

تھا، اس میں بعض قلبی جذبات بھی آگئے تھے اسی لئے ذیل میں وہ خط نقل کیا جارہا ہے۔

"معظمی و محترمی" دامت برکاتھم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

آپ کے گرامی نامہ، ہفت روزہ "نقیب" اور دیگر ذرائع سے یہ معلوم کر کے حد درجہ رنج وملال ہوا کہ حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمن صاحب دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آج سے پچھتر (۷۵) سال قبل جب امارت شرعیہ کی تاسیس عمل میں آرہی تھی، اس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی وجہ سے مولانا کی حیثیت ایک "تاریخی" بن گئی تھی، اپنے دور شباب سے عہد پیری تک نصف صدی سے زائد وہ جو امارت کے نشیب وفراز، اتار چڑھاؤ، سرد گرم اور تنگی وفراخی کے حالات کو اپنی نگاہوں سے دیکھتے رہے، اس لحاظ سے دنیا سے ان کے گذر جانے کا مطلب امارت کے اس دور کا خاتمہ ہے، جس دور میں حضرت مولانا سجاد کی آغوش میں مولانا آزاد کے زیرِ سایہ اس نے آنکھیں کھولی تھیں، اب تو ماشاء اللہ وہ اپنے زمانہ شباب میں داخل ہو کر بہار جاں فزاد کھلا رہی ہے، اور اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے ؎

ایک دور تھا جو ہو چکا، ایک دور ہے جو آئے گا
ایک خواب دیکھا جا چکا، ایک خواب دیکھا جائے گا

ایک ادارہ کی زندگی میں افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں، یہ کوئی اہمیت کی بات نہیں ہے، اہمیت کی بات یہ ہوتی ہے کہ جانے والے کیسے تھے اور آنے والے کیسے ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی جماعتوں اور تنظیموں میں امارت شرعیہ بڑی ہی خوش قسمت جماعت اور تنظیم ہے کہ جانے والے امیر شریعت اور نائب امیر شریعت کے بعد جو بھی نئے امیر شریعت اور نائب امیر شریعت آئے، انھیں امارت شرعیہ کے قیام کی غرض وغایت اور کاز سے والہانہ لگاؤ اور جذباتی تعلق رہا، اور اخلاف اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے رہے، ورع وتقوی، للہیت اور خدا ترسی، شعور وآگہی، علم ودانش، مومنانہ فراست وبصیرت اور ذکاوت وذہانت کے اعتبار سے اپنی نظیر اور مثال آپ رہے، ان کی شخصیت ملت کیلئے بھی قابل احترام اور لائق اعتماد رہی۔ راقم الحروف کو امید ہی نہیں یقین ہے کہ امیر شریعت اور نائب امیر شریعت کے حالیہ انتخاب میں یہ خوشگوار روایات باقی رہیں گی، اور ارباب حل وعقد اپنی بھاری، نازک اور دیانت دارانہ ذمہ داریوں سے بصیرتِ صدیقیؓ اور فراستِ مرتضویؓ کو کام میں لاتے ہوئے اس مرحلہ سے خیر وخوبی کے ساتھ گذر جائیں گے۔

جہاں تک تعلق امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کا ہے تو واقعہ ہے کہ وہ اپنی علمی عظمت، عالمانہ وقار، خلوص وللہیت، تقوی وپرہیز گاری، وسیع النظری، عالی حوصلگی اور جرات مندی، ان

تمام اعتبارات سے علماء کی جماعت میں نہایت ممتاز تھے۔ ان کے رخصت ہوجانے سے علم و عمل اور رشد و ہدایت کا ایک جلتا چراغ بجھ گیا۔ مگر اس چراغ سے جو سینکڑوں چراغ روشن ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ یہ فضا اور ماحول کو منور رکھیں گے۔

راقم الحروف کا احساس ہے کہ حضرت امیر شریعت رابع کے وصال کے بعد امارت شرعیہ کے حالات کے پس منظر میں مولانا مرحوم کی ذات گرامی ملت اسلامیہ بہار واڑیسہ کے لیئے اتحاد کا عنوان اور نشان تھی۔ امید کہ امارت شرعیہ اپنے سفر میں اس عنوان اور نشان کو ہمیشہ باقی رکھے گی۔

امارت شرعیہ کی "تاریخ سازی" میں حضرت قاضی صاحب مدظلہ کی مبصرانہ، حوصلہ مندانہ اور فریسانہ قیادت اور آپ کی مدبرانہ، منتظمانہ اور مخلصانہ رہنمائی کا بڑا دخل ہے۔ الحمدللہ ایک طویل عرصہ سے اس قیادت اور رہنمائی کا تسلسل چلا آرہا ہے اللہ تعالیٰ تادیر اس تسلسل کو باقی اور جاری رکھے یعنی ؎

شمع جلتی رہے ہوتا رہے محفل کو فروغ

آپ دونوں حضرات سے زیادہ اس حقیقت کو کون جانے اور سمجھے گا کہ ادارہ کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ مگر اس کے اعلیٰ ذمہ داروں کی آپسی مفاہمت، باہمی اعتماد، حوصلہ مندی اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ، ادارہ کی کشتی کو ہر گرداب اور بھنور سے بچالے جاتا ہے:

تھپیڑے پر تھپیڑے کھا رہی ہے   مگر کشتی سلامت جا رہی ہے

یہ لکھتے ہوئے شدید احساس ہے کہ اپنی عمر اور علم کے اعتبار سے مجھے جس حد میں رہنا چاہیئے۔ اس سے تجاوز کر رہا ہوں۔ اور سورج کو چراغ دکھانے اور لقمان کو حکمت پڑھانے کی جرات کر رہا ہوں مگر ؎

الفاظ کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا   جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، جس نے پرانے اور نئے ہندوستان میں "قصہ قدیم و جدید" سے بے نیاز، ایک ہمہ وقتی دینی اور ملی کام کی بنیاد ڈالی، نہج متعین کیا، ضابطے بنائے، یہ کام نہ صرف ان دو صوبوں میں دن بدن ترقی اور استحکام حاصل کرتا رہے، بلکہ پورے ہندوستان میں یہ کام ایک "پیغام" کی شکل اختیار کرلے۔ الحمدللہ اس کیلئے راہیں ہموار ہوتی نظر آرہی ہیں اور ہر سو یہ خوشبو پھیل رہی ہے۔

یکم نومبر ۹۸ کو ارباب حل و عقد کا جو اجتماع ہے اس کا دعوت نامہ ملا۔ انشاء اللہ شرکت کی سعادت حاصل کروں گا۔ تفصیلی پروگرام سے آج کل میں مطلع کروں گا"۔

امیر شریعت کے انتخاب کے سلسلہ میں یکم نومبر ۱۹۹۸ کو ارباب حل و عقد کا جو اجتماع منعقد ہونے والا تھا اس میں شرکت کا عزم تھا، لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکا، مگر امارت شرعیہ کی تاریخ اور کام سے جذباتی تعلق کی بنیاد پر اسی زمانہ میں جو دوسرا خط حضرت ناظم امارت شرعیہ مولانا سید نظام الدین صاحب مدظلہ کے نام روانہ کیا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

"آپ کے گرامی نامہ کے جواب میں عریضہ ارسال کرچکا ہوں، اس کے لحاظ سے ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ انتخاب امیر شریعت سے متعلق ارباب حل وعقد کا جو خصوصی اجتماع منعقد ہورہا ہے اس میں شرکت کی سعادت حاصل کروں، اندرونی خواہش بھی یہی تھی اور ہے، لیکن ادھر ایک سال سے طبیعت کے اتار چڑھاؤ کی بناء پر سفر کا ارادہ بنتا ہے اور بگڑتا ہے، مجوزہ پروگرام کے مطابق آج مجھے شام کی ٹرین سے پٹنہ کیلئے روانہ ہوجانا چاہیئے تھا مگر۔

اے وائے مجبوری انساں　　　کیا سوچے اور کیا ہوجائے

اپنے معالج کے مشورہ کی بنیاد پر سفر سے رک جانا پڑا، اور ان دنوں شہر سے کچھ فاصلہ پر ذیابطیس سینٹر میں زیرِ علاج ہوں، برسات کی ہوا، بارش میں بھیگنے اور سرد گرم کی امتزاجی کیفیت کی وجہ سے دس روز قبل آنکھ، ہونٹ اور چہرہ پر بھی مضر اثرات مرتب ہوئے، ان تمام چیزوں کا علاج بیک وقت جاری ہے۔ الحمدللہ پہلے سے افاقہ ہے۔

امارت شرعیہ کی جو دینی، ملی اور تاریخی حیثیت ہے، اس سے آپ حضرات سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے، میرے خیال میں ان تمام حیثیتوں کو نہ صرف باقی رہنا چاہیئے بلکہ ان میں خوشگوار اضافہ بھی ہوتا رہے یعنی :　　　ہر نقش پا بلند ہو دیوار کی طرح

امیر شریعت کے انتخاب کے اس نازک اور اہم موقع پر حالات اور ماحول کے پس منظر میں حد درجہ صبر و تحمل، حکمت و تدبر اور فراست و بصیرت کی ضرورت ہے، امید کہ ارباب حل وعقد کا یہ اجتماع اپنی اس ذمہ داری کو پورے طور پر محسوس کرے گا اور ماضی کی روایات، حال کے احوال اور مستقبل کے خاکوں کو سامنے رکھتے ہوئے جانبداری اور طرفداری کے ہربت کو آستین سے نکالتے ہوئے ایماندارانہ اور دیانتدارانہ طریقہ پر اپنے "امیر محترم" کا انتخاب کرلے گا۔ شریعت کے کسی مسئلہ کو شرعی خطوط اور بنیادوں پر ہی حل کیا جائے تو اس میں خدا کی مدد اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر راستہ انتشار، خلفشار اور اضطراب کا ہے ""امارت" بغیر خواہش، طلب، ارادتی منصوبہ بندی اور شخصی حصار میں لانے کی بجائے از خود آجائے تو بلاشبہ یہ "خدائی انعام" ہے، اور اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو ایسی امارت کا "انجام" سب کو معلوم ہے، ایسی شکل میں ممکن ہے کہ "امیر" باقی رہے لیکن "امارت" دن بدن برف کی طرح گھلتی اور پگھلتی جائے۔ اللہ تعالی اس دن سے امارت کو محفوظ رکھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ ارباب حل وعقد کا کوئی رکن اپنی واقعی کسی مجبوری سے اس کے کسی اجتماع میں شرکت نہ کرسکے تو اسے تحریری رائے دہی کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ تاہم امارت شرعیہ سے جو جذباتی لگاؤ اور تعلق ہے اس کے پیش نظر اپنے "قدم" سے تو شریک نہیں ہورہا ہوں مگر "قلم" سے شرکت کی ہمت کررہا ہوں، اس سلسلہ میں راقم الحروف کی مختصر ترین رائے یہ ہے کہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم کو "امیر سادس" کی حیثیت سے منتخب کرلیا جائے امارت شرعیہ کے حق میں ان کی خدمت، دل

چسپی اور والہانہ لگاؤ و تعلق کا ایک طویل اور مخلصانہ ریکارڈ ہے۔

بانی امارت شرعیہ حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ نے امیر شریعت کے سلسلہ میں جو اوصاف تحریر فرمائے ہیں ارباب حل وعقد کے اجتماع کے آغاز پر ہی تذکیری طور پر من وعن اس کا پڑھ دینا بہر طور مناسب رہے گا۔ بسا اوقات انسان تو دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے مگر اس کا اخلاص، الفاظ کی قوت، طاقت اور شوکت کو کم نہیں کرتا، انشاء اللہ مولانا محمد سجاد علیہ الرحمہ کے الفاظ کی خوشبو اسی طرح پھیلے گی جس طرح تازہ پھول مشام جاں کو معطر کرتا ہے۔ میرے خیال میں اہل اللہ اور اصحاب اخلاص کی یہی وہ روحانیت ہے کہ جن کے جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی یہ روح اور روحانیت باقی رہتی ہے، اور امتداد زمانہ کا کوئی اثر ان پر نہیں پڑتا۔

اللہ تعالی حضرت قاضی صاحب دامت برکاتہم کو مکمل صحت سے نوازے حضرت ناظم صاحب بھی تندرستی کے ساتھ رہیں۔۔ چونکہ ایک ہی طرح کے مضمون پر مشتمل خط آپ دونوں حضرات کو مجھے روانہ کرنا تھا، اس لئے مشترکہ ہی خط سے کام چلایا ہے۔ توقع ہے کہ اسے کسی طرح کی بے ادبی اور گستاخی پر محمول نہیں فرمائیں گے"۔ (خط، تحریر کردہ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۹۸ء ارسال کردہ بذریعہ فیکس)

بحمداللہ مورخہ یکم نومبر ۱۹۹۸ء کو امیر شریعت سادس کی حیثیت سے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب مدظلہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ انتخاب بہار واڑیسہ کے ارباب حل وعقد کی اصابت رائے اور فکر صحیح کا مظہر ہے۔ آپ گذشتہ تیس سال سے زیادہ عرصہ سے امارت شرعیہ کے انتظام وانصرام کے رکن رکین ہیں، اور نظام امارت کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں آپ کی مساعی اور کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ یہ اطلاع یقیناً افسوس ناک ہے کہ بعض عناصر نے غیر سنجیدہ طریقوں سے منصب امارت حاصل کرنے کی سعی کی لیکن بہار و اڑیسہ کے بلند نگاہ اور بالغ نظر علماء وزعماء اور ارباب حل وعقد نے ایسی کوششوں کو یکسر ناکام کردیا۔ اور بالآخر اتفاق رائے سے امیر شریعت سادس کا انتخاب عمل میں آیا۔ یقیناً یہ انتخاب نہایت مبارک و مسعود ہے اور پورے ملک میں اس انتخاب پر طمانیت کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہم سب موجودہ امیر شریعت کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کا عہد امارت، امارت شرعیہ کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ ہوگا۔ اور امارت نہ صرف بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرے گی بلکہ پوری امت اسلامیہ ہند کی جراتمندانہ اور دانشمندانہ قیادت کا فریضہ انجام دے گی۔ ہم جیسے لوگوں کو یہ بھی توقع ہے کہ "نائب امیر شریعت" کی حیثیت سے ایسی شخصیت سامنے آئے گی جس کی امارت سے وابستگی دیرینہ اور گہری ہے، اور اس کے ساتھ امارت کی خدمت کا وسیع اور عظیم ریکارڈ ہے، اپنی بصیرت اور جذبہ علم و تحقیق سے ہند اور بیرون ہند میں جانی پہچانی جاتی ہے، اللہ تعالی امارت شرعیہ کے نظام میں ہر اعتبار اور ہر سطح سے استحکام بخشے۔ اور "نائب امیر شریعت" کی حیثیت سے جو شخصیت بھی سامنے آئے، اس سے اس عہدہ کا وقار اور اعتبار مزید بڑھے اور قائم ہو۔

ہندوستان میں سماجی بگاڑ جس تیزی سے بڑھ رہا ہے شادی بیاہ میں مسرفانہ اخراجات، منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان، اخلاقی قدروں کا انحطاط اور مغربی تہذیب کی تیز رفتار آمد۔ ان حالات نے اصلاح معاشرہ کی ضرورت کو پہلے سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس کے مقاصد میں سے ایک اہم ترین مقصد معاشرہ کی اصلاح بھی ہے۔ بورڈ نے اپنے متعدد عمومی اور عاملہ کے اجلاس میں اصلاح معاشرہ کے کام کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کیا ہے، اور اس کیلئے عملی کوششوں کا پروگرام بھی بنایا ہے تاہم یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اصلاح معاشرہ کا کام علماء و خواص امت کی جس توجہ کا متقاضی ہے اس درجہ اس کام پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانان ہند کا مشترکہ اور حقیقی پلیٹ فارم ہے اور بورڈ سے بڑھ کر کسی کی آواز اس سلسلہ میں موثر نہیں ہو سکتی اس لئے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کرنا وقت کی نہایت اہم اور اولین ضرورت ہے۔ بورڈ نے گذشتہ حالیہ لکھنؤ اجلاس میں اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ میں جو بعض منصوبے تیار کئے ہیں، خدا کرے خاطر خواہ طریقہ پر ان کی تکمیل ہو سکے۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے اور اس کی جمہوری قدروں کے باقی رہنے میں ہی اس کی بقا اور اس کی سالمیت مضمر ہے۔ ملک کے معماروں نے خوب سوچ سمجھ کر ملک کیلئے اس نظام کا انتخاب کیا تھا۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک کا نظام تعلیم ابتداء ہی سے فرقہ پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں کا نشانہ رہا ہے، اور اس بات کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جائے۔ لیکن محب وطن اور سنجیدہ اصحاب نظر کی کوششوں سے اس مہم میں اس درجہ کامیابی حاصل نہیں ہو پائی تھی جو فرقہ پرست عناصر کا مطمح نظر ہے۔

لیکن موجودہ بی جے پی حکومت نے اپنے فرقہ وارانہ خیالات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے، اور وہ علانیہ طور پر نظام تعلیم کا "ہندوکرن" کرنے میں مشغول ہے۔ اسکولوں میں وندے ماترم، سرسوتی وندنا اور تاریخ کی کتابوں سے پیغمبر اسلام اور حضرت مسیح وغیرہ سے متعلق مضامین کو نکال دینا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں اور اقلیتوں کو خصوصاً اور ملک کے سنجیدہ سیکولر اور اس کی سالمیت کے خواہاں دانش وروں کو عموماً فکر مند ہونے اور اس صورت حال کا تدارک کرنے کی ضرورت ہے، اگر بے توجہی برتی گئی تو اس سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آگئی ہے کہ عراق کے مسئلہ کو امریکہ نے اپنے لئے معاشی دشواریوں کا حل بنالیا ہے۔ معمولی بہانوں سے عراق کے خلاف فوجی اقدام کا انتباہ پھر اپنے فضائیہ اور بحریہ کو متحرک کرنا

اور عرب ملکوں کو خوف دلاکر ان سے چنگی وصول کرنے کی کوشش اب امریکہ کے معمولات میں سے ہے اور خود عرب ملکوں اور خلیجی حکومتوں نے بھی امریکہ کی اس چال کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

اس کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ گذشتہ دو تین سالوں سے عین رمضان المبارک سے کچھ پہلے امریکہ کی جانب سے اس طرح کی جارحانہ حرکت شروع ہوتی ہے جس سے فطری طور پر عالمِ اسلام انتشار کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ گویا یہ مسلمانوں کو عبادت کی لذت اور رجوع الی اللہ کی نعمت سے محروم کرنے کا راستہ ہے۔ امریکہ کی ان ناشائستہ حرکتوں کی وجہ سے عراق کی جغرافیائی حیثیت میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ امریکہ اس کو اپنے مفادات کیلئے آلہ کار بنائے ہوا ہے۔ اور در حقیقت نہ یہ سیاسی مسئلہ ہے۔ نہ دفاعی اور نہ فوجی بلکہ اس کے پیچھے محض معاشی عزائم کار فرماہیں۔ اللہ تعالی عالم اسلام کو اس بے آبروئی اور رسوائی سے نجات دے۔

بی۔ جے۔ پی حکومت نہ صرف سیاسی اعتبار سے ہچکولے کھارہی ہے اور اس نے ملک کی جمہوری روایات سے انحراف کیا ہے بلکہ معاشی اعتبار سے بھی اس نے ملک کو اس مقام پر پہونچادیا ہے۔ کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گرانی نے آسمان کو چھولیا ہے۔ اشیاء ضرور یہ کی قلت شہر ودیہات ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور فصل وموسم سے بھی بے نیاز ہے۔ پیاز، مرچ اور خوردنی تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت نے ہر خاص وعام کو گرفتار بلاکر رکھا ہے۔ اگر کوئی اور حکومت ہوتی تو ذرائع ابلاغ نے آسمان سر پر اٹھالیا ہوتا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اگر اس وقت منصفانہ انتخاب ہوجائے تو شاید بی جے پی کو سر چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے۔ اسی لئے اس نے پھر سے ہندوتوا کے ایجنڈہ کو زندہ کرنا شروع کردیا ہے۔ لیکن انشاء اللہ ہندوستان کے عوام اس حکومت کی ناکامیوں کو فراموش نہیں کریں گے اور مستقبل قریب میں بعض ریاستوں میں ہونے والے اسمبلی الکشنوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس نااہل حکومت سے جلد سے جلد اس ملک کو نجات دے ورنہ اس سے بڑے ضرر کا اندیشہ ہے۔ اور خدا نخواستہ ملک کا دستوری اور جمہوری ڈھانچہ تباہی کے دہانے پر نہ پہنچ جائے۔ اللہ ہمارے اس ملک اور ملک کے تمام باشندوں کو صحیح اصول اور نہج پر باقی رکھے۔

محمد رضوان القاسمی

۲۵/ رجب ۱۴۱۹ھ

۱۶/ نومبر ۱۹۹۸ء

انٹرنیٹ پر تحریفِ قرآن کی خطرناک سازش

چار اختراعی اور جعلی سورتوں کا اضافہ

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی

اس وقت پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی لہر تیزی سے جاری ہے، اسلام دشمن قوتوں کی مشترکہ تدبیروں اور گہری سازشوں کے باوجود، اسلام کی صداقت، اس کی ابدی تعلیمات اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ اس کے دینی و مذہبی اور سماجی احکام کا اعتراف اور ان کی قدر و منزلت کا احساس پوری انسانی دنیا میں بیدار ہو رہا ہے عالمی سطح پر دعوتِ اسلامی اور خدمت دین سے وابستہ شخصیتوں، اداروں اور تحریکوں کی جد و جہد اور پیہم سعی و کوشش کے مفید اور بہتر نتائج برآمد ہو رہے ہیں، خود امریکہ، برطانیہ کینیڈا، فرانس اور ان جیسے دیگر مغربی و یوروپی ممالک میں قبول اسلام اور فروغ مذہب کے اعداد و شمار تیزی سے بڑھنے لگے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک قابل ذکر اور حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ مغربی نوجوان بھی مغرب کے مادہ پرستانہ نظام زندگی سے اب بیزار ہو چکے ہیں اور وہ اس بے روح نظامِ زندگی سے فرار اور گریز کی راہ اختیار کرتے ہوئے امن و سلامتی، روحانی تسکین اور قلبی طمانیت کی تلاش میں، اسلام کے سایہ رحمت و عافیت میں پناہ لے رہے ہیں ——— یہ صورتِ حال مغربی طاقتوں اور اسلام مخالف لابی کے لئے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔ اسلامی بیداری کی اس لہر کو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ کی طرح وہ مختلف انداز کے حربے اور طریقے استعمال کر رہے ہیں۔

یوں تو اسلام اور اسلامی نظام حیات اور تہذیب و تمدن کے خلاف مغربی دنیا

کی ہرزہ سرائی اور مفوات طرازی کوئی نئی بات نہیں ہے، ان لوگوں نے تو اسلام کے خلاف خود ساختہ نظریات اور فلسفوں کا ایک طومار باندھ دیا ہے۔ اسلام اور مقدساتِ اسلام کی اہانت، اسلامی تعلیمات میں تحریف وتزویر دکذب بیانی، افترا پردازی اور ملمع سازی) توان کا قدیم مرض اور پرانا جرم ہے، لیکن افسوس اس پر ہے کہ عالمی یہودیت کی شہ پر مغرب کی مجرمانہ اور فریب کارانہ حرکت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب وہ قرآن مقدس کے الفاظ میں الٹ پھیر اور مضامین میں من مانی تبدیلی کرتے ہوئے کلام الٰہی کی توہین اور ذاتِ رسالت کی اہانت پر اتر آئے ہیں، اس کا مقصد ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی دل آزاری ہو۔ اسلام کے بارے میں تشکیکی ذہن پیدا کیا جائے، ملتِ اسلامیہ کا مذہب، دین، قرآن اور صاحبِ قرآن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے جو گہرا اور مضبوط ایمانی، دینی اور عقیدت مندانہ تعلق ہے اسے بالکل ختم کردیا جائے اور اسلام کے بارے میں یہ تصور عام کیا جائے کہ وہ اپنی حقیقی اور صحیح تعلیمات پر قائم نہیں ہے اور اپنے فرسودہ نظام وتعلیم کی بنیاد پر انسانیت کی رہبری ورہنمائی کی صلاحیت سے وہ محروم ہوچکا ہے۔

اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ مغربی ذرائع ابلاغ عالمی یہودیت کے زیر اثر فساد وتخریب کا آلہ اور ذریعہ بن چکے ہیں، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کوئی معمولی سا واقعہ یا کوئی چھوٹی سی بات سامنے آجائے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور وہ خبر مغربی ذرائع ابلاغ میں نمایاں اور ممتاز ہوکر سامنے آتی ہے۔ اس نوعیت کی خبریں مغربی میڈیا کی آنکھ میں بہت اہم قرار پاتی ہیں، لیکن اسلامی دعوت یا مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ہو تو پوری شدت کے ساتھ میڈیا اسے دبا کر رکھ دیتا ہے۔ اِدھر جب سے دنیا انٹرنیٹ سے مربوط ہوئی ہے تو سمجھیے کہ آزادی کے تمام دروازے مغرب پر وا ہوگئے۔ نہ ہی دین ومذہب کا تحفظ ہے اور نہ اعتقادات ومقدسات کی پاسداری ہے، انٹرنیٹ پر جو لوگ قابض ہیں، انہیں ہر طرح کی چھوٹ ملی ہوئی ہے، اس کا استعمال ہر نوعیت کے مقاصد کے لئے کیا جاسکتا ہے —— اگرچہ کہ انٹرنیٹ

کو جنس اور جرائم وغیرہ کے لئے استعمال کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے لیکن مذہب سے متعلق کسی بھی پروپیگنڈے کی اجازت ہے، بلکہ اسلام کے بارے میں بے بنیاد اور زہر آلود مواد پیش کرنے کی پوری حوصلہ افزائی کی جارہی ہے ——— اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر مختلف انداز سے رکیک حملوں اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ تو پہلے سے چل رہا ہے مگر اب انٹرنیٹ کے ذریعہ قرآنِ حکیم میں تحریف و تزویر کا جو ناپاک شر انگیز اور مذموم سلسلہ ان لوگوں نے شروع کیا ہے، اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ کا مقصد ایجاد ہی یہی ہے۔ کیونکہ مغرب کے اسلام دشمن بار بار یہ اعلان کرچکے ہیں کہ جب تک قرآنِ مجید اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں (الفاظ و معانی کی مکمل حفاظت کے ساتھ) باقی رہے گا، اس وقت تک اسلام بھی زندہ و تابندہ رہے گا۔

جو لوگ انٹرنیٹ کا مشاہدہ کررہے ہیں، وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ قرآنِ مجید کی چار جعلی سورتیں انٹرنیٹ پر پیش کی جارہی ہیں، اس سے مغرب کی شاطرانہ اور عیارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے، جو چار سورتیں پیش کی جارہی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:-

۱- سورۃ التجسد (آیات ۱۵) ۲- سورۃ الایمان (آیات: ۱۰)

۳- سورۃ المسلمون (آیات: ۱۱) ۴- سورۃ الوصایا (آیات: ۱۶)

اگرچہ ان فرضی اور کفریہ آیات کا ترجمہ کرنا بھی تکلیف دہ اور ناگوار معلوم ہوتا ہے، تاہم "نقل کفر، کفر نہ باشد" کے طور پر ذیل میں ہم صرف اس طرح کی دو سورتوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں تاکہ عربی زبان سے ناواقف اور عالمی صہیونیت کی گھناؤنی سازش سے ناآشنا مسلمان بھی جان سکیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے عقائد و تعلیمات پر کس طرح حملے ہورہے ہیں۔

سورۃ التجسد (یعنی اللہ تعالیٰ کا انسانی جسم اختیار کرنا) پوری سورت حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"وہ رب العالمین پاک ہے اس سے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بیٹا بنائے، جو لوگ قبل ازیں نازل شدہ کتاب میں شک کرتے ہیں، ان سے

کہہ دو کہ مسیح اللہ کی مخلوق نہیں تھے، وہ آفرینش سے پہلے بھی اللہ کے ساتھ تھے اور ہمیشہ سے اللہ کے ساتھ ہیں، وہ اللہ میں ہیں اور اسی سے ہیں، جب ان کو دونوں جہاں کے باپ نے اپنے وعدہ کے مطابق بھیجا تو وہ کلمہ سُن کر کنواری کے بطن میں اتر گئے اور ایک جسد بن کر اس کے بطن سے باہر آ گئے انسان کے ساتھ رہے، انسان کو علم سکھایا، انسان کا فدیہ بن کر مر گئے۔ وہ انسان کی طرح قبر میں جا سوئے اور اس کے تین دن بعد اپنے آسمانی باپ کے پاس چلے گئے، وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور سخت بات کہی، اللہ تعالیٰ ہرگز ان کی مہلت میں اضافہ نہ کرے گا، جو لوگ اللہ اور اس کے مسیح پر ایمان لائے، ان کے لئے ہے مغفرت اور نعمت بھری جنتیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

سورۃ "المسلمون" کے نام سے جو آیات گھڑی گئی ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:-

"کہو اے مسلمانو! تم ضلالِ بعید میں پڑے ہوئے ہو، وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ سے اور اس کے مسیح سے، ان کے لئے ہے جہنم کی آگ اور عذابِ شدید، اس دن چہرے جھوٹے ہوں گے، تاریک ہوں گے، اللہ سے فریاد کرتے ہوں گے اور اللہ وہ کرتا ہوگا جو وہ چاہے گا، جس روز رحمان کہے گا اے میرے بندو! میں نے تم سے پہلے والوں پر تورات اور انجیل میں ہدایات نازل کر کے احسان کیا، پھر تم نے میری نازل کردہ ہدایت سے انکار کیوں کیا اور سیدھا راستہ کیوں کھو دیا؟ کہا پروردگار! ہم نے اپنے آپ کو گمراہ نہیں کیا، بلکہ ہمیں تو اس نے گمراہ کیا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ مرسلین میں سے ہے، اور جب کہا اللہ نے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم نے گمراہ کیا میرے بندوں کو؟ (نعوذ باللہ) اور انہیں کافر بنا دیا؟ (استغفر اللہ) کہا میرے پروردگار! مجھے گمراہ کیا شیطان نے (استغفر اللہ) وہ بنی آدم کو سب سے بڑھ کر خراب کرنے والا ہے۔ اللہ بخش دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے

توبہ کی، ان لوگوں میں سے جنہوں نے گمراہ کیا انسان کو، اور وہ بھیجے گا اس کو جو شیطان کا مددگار تھا جہنم کی طرف، جو بہت برا ٹھکانا ہے اور جب اللہ کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کو علم ہوتا ہے اپنے فیصلہ کا، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان کفریات وخرافات پر مشتمل سورتوں کا اصل مقصد اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے شدید تعصب اور نفرت کا اظہار ہے۔ آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی متشدد اور متعصب عیسائی کی حرکت ہے، اس سے اس کی حاسدانہ و مریضانہ ذہنیت اور مرعوبانہ فکر جھلکتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے اور سینہ کینہ سے بھرا ہوا ہے۔

جدید میڈیائی وسائل میں انٹرنیٹ کا یہ پہلو بڑا خطرناک ہے کہ اس کو ہر شخص جو انٹرنیٹ کمپنی کے SUBSCRIBERS میں شامل ہو، آسانی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے، خواہ مقصد تعمیری ہو یا تخریبی، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بیدار اور متحرک ہونے کی ضرورت ہے، جو لوگ انٹرنیٹ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور باضابطہ کمپنی کے صارفین میں ہیں، انہیں کمپنی سے شدید احتجاج کرنا چاہئے اور آئندہ اس قسم کے واقعات کے سدِّباب کی یقینی ضمانت حاصل کرنی چاہئے، کمپنی سے یہ بھی مطالبہ کیا جائے کہ انبیاء و رسل، مذاہب وادیان اور دیگر مقدس مذہبی شخصیات کی توہین اور مذہبی دل آزاری کی کسی بھی حرکت پر پابندی عائد کر دے، نیز مسلمانوں کے باشعور اور باخبر طبقہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس طرح کی خرافات سے پورے طور پر باخبر رہیں اور شعور وبصیرت کے ساتھ علمی وعملی اعتبار سے دین کی مدافعت کو اپنا ایک اہم دینی فریضہ باور کریں۔

جہاں تک تعلق مذکورہ تحریفِ قرآنی کا ہے تو مسلمان وعدۂ الٰہی اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۹) ترجمہ: "اس قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں،، پر بھرپور ایمان ویقین رکھتے ہیں اور تمام آسمانی کتابوں میں جو چیز اسے ممتاز کرتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ

نے لیا ہے، اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی، چودہ سو سال سے زائد عرصہ گذر گیا، اس کے باوجود اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے یہ جو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں، بلکہ ایک سرسری سروے کے مطابق پوری دنیا میں (۷۰) لاکھ سے زائد حفاظِ قرآن، قرآن کے حرف حرف کو اپنے سینے میں محفوظ کئے ہوئے ہیں، وہ بھی حفاظت کے خدائی نظام کا ایک حصّہ ہی ہیں۔

حفاظتِ قرآن کا جو وعدۂ الٰہی ہے اس کی تصدیق و توثیق قیامت تک مختلف ذرائع سے ہوتی رہے گی، حفاظتِ قرآن کے سلسلہ میں جو عجائب اور حیرت انگیز واقعات روئے زمین پر پیش آچکے ہیں، ان کی تفصیل کا یہ موقع ہے اور نہ گنجائش، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام اور قرآن کے مخالفین کی ہزار کوششوں کے باوجود، اس کے تمام حروف و نقوش کا محفوظ رہنا خود ایک دلیل معجزنما ہے، اسلام کے خلاف سازشوں اور فریب کاریوں کا یہ سلسلہ روزِ اول ہی سے ہے۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ چمکتا رہا ہے اور چمکتا رہے گا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی،

سچّی بات تو یہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں نے ایک محاذ بنا یا ہے اور اپنے منصوبوں کے مطابق وہ اسلام کی بیخ کنی اور دین و شریعت کے خاتمہ کے لئے بین الاقوامی سطح پر مال و دولت اور طاقت و قوت کا استعمال مسلسل کرتے آرہے ہیں، دہشت گردی اور تشدد پسندی کی نسبت اسلام کی طرف کرکے اسلام کی تصویر مسخ کررہے ہیں جب کہ دہشت گردانہ اور تشدد پسندانہ سرگرمیوں کا وہ خود ایک عالمی ریکارڈ رکھتے ہیں، جس طرح چراغ پھونک مار کر بجھا دیا جاتا ہے، مغربی قوتیں اور مخالفین و معاندین چاہتے ہیں کہ اسی طرح اسلام کا چراغ گُل کردیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (توبہ: ۳۲) ترجمہ: "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے

منھ سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ کو نامنظور ہے۔ (ہر صورت) بجز اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچائے، خواہ کافروں کو دکیسا ہی) ناگوار گزرے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مفسّر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یقیناً حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے، مولانا فرماتے ہیں "آیت کی صداقت پر امّت کی چودہ سو سال کی تاریخ گواہ ہے، یہود، نصاریٰ، مشرکین، غرض ہر معاند و مخالف مکر و حیلہ، زور و جبر کے ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اسلام ہے کہ پھیلتا ہی جاتا ہے اور پیروانِ اسلام کی تعداد میں اضافہ ہی روز افزوں ہے۔ یہاں تک کہ مسیحی مشنریوں کو اعتراف ہے کہ بے دریغ روپیہ خرچ کرنے اور نہایت درجہ مستحکم نظام ہونے کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے مشن ناکام ہو رہے ہیں۔"

مولانا دریابادیؒ نے بلاشبہ ایک حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، یعنی یہ کہ:

ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

تاہم ایسے تمام فتنوں اور سازشوں کے مواقع پر اہلِ اسلام اور اصحابِ قرآن کو ان کی بیخ کنی اور تدارک کے لئے جو کچھ کرنا چاہئے، اس سے غفلت، ایک مجرمانہ حرکت کے ہم معنیٰ قرار پائے گی۔ دانا اقبالؔ نے ایسے ہی موقع کے لئے دانائی کا یہ پیغام دیا ہے کہ

~ عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

آپ نے مضمون "انٹرنیٹ پر تحریفِ قرآن کی خطرناک سازش" میں جن اختراعی اور جعلی سورتوں کے بارے میں پڑھا ہے، ان میں سے دو کے ترجمے مضمون ہی میں شامل ہیں، البتہ ایک جعلی اور اختراعی سورت جس کا نام انہوں نے "الوصایا" رکھا ہے اندازہ اور نمونہ کے طور پر ذیل میں اس کا عکس دیا جارہا ہے۔

سورة الوصايا :

" المد (١) إنا أرسلناك للعالمين مبشراً ونذيراً (٢) تقضي بما يخطر بفكرك وتدبر الأمور تدبيراً (٣) فمن عمل بما رأيت فلنفسه ومن لم يعمل فلسوف يلقى على يديك جزاءاً مريراً (٤) إنا أعطينا موسى من قبلك من الوصية مرة ونعطيك عشرات أخرى إذ قد ختمنا بك الأنبياء وجعلناك عليهم أميراً (٥) فانسخ ما لك أن تنسخ مما أمرناهم به فقد سمحنا لك أن تجري على قراراتنا تغييراً (٦) قل لعبادي الذين آمنوا إن تثاءبوا يستعيذوا بالرحمن أن لا يضحك منهم الشيطان وليكبروا الله إن عطسوا تكبيراً (٧) أن لا يقتنوا في بيوتهم كلباً ولا يضعوا على حيطانهم تصويراً (٨) وإذا أرادوا انتعالا فليبدأوا باليمين قبل الشمال وإن لم يفعلوا فقد اقترفوا ذنباً كبيراً (٩) وإن تبرزوا فليمسحوا مؤثراتهم بحجار ثلاثة وينتهوا عن الروث إذ قد جعلناه للجن غذاء وعلى المؤمنين أمراً محظوراً (١٠) قل لعبادي الذين آمنوا يغزوا من أرادوا ويقتلوا من أجل رزقهم ومن لم يغز منهم أولم يحدث نفسه بغزو مات منافقاً منكوراً (١١) وللذين يخشون سحراً يأكلوا سبع عجوات ينجيهم الله من السحر ويبعد عنهم شراً مستطيراً (١٢) قل لعبادي إن أرادوا أن يحلفوا فليحلفوا بالله ولا يخافوا تبذيرا (١٣) وأن ينكحوا ما طاب لهم من النساء مثنى وثلاث ورباع أو ما ملكت أيمانهم ، إنا جعلنا لهم الدين أمرا يسيرا (١٤) وإذا فرغت من بين يديك الوصايا فاطلب إليك جبريل يأتيك ساعيا مأموراً (١٥) وإن شغل جبريل عنك فعليك بورقة بن نوفل واستفد منه قبل أن نتوفاه فيصبح الوحي عليك أمراً عسيرا (١٦) "

مولانا عبد المجید قاسمی

گفتگو کے آداب
قرآن وحدیث کی روشنی میں

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس کے ذریعہ زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل طور پر رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، اسلام نے جہاں عبادات اور دیگر معاملات پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے، وہیں بات چیت اور گفتگو کے طور وطریق سے متعلق بھی احکام بتلائے ہیں، جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی اور بعض اوقات تھوڑی سی غفلت اور بے توجہی بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، بات کرنا اور اپنے مقصد ومنشاء کا مؤثر اور بہتر طریقے پر اظہار انسان کا خاصہ اور اس کا امتیاز ہے، ہر شخص کو قدم قدم پر مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور مختلف مسائل درپیش ہوتے ہیں، ان سے بات کس طرح کی جائے اور اس میں کس چیز کا لحاظ کیا جائے؟ اس کا خیال کرنا ضروری ہوتا ہے، بعض لوگوں کی زبان ہی لوگوں کے اس سے نفرت کا باعث ہوجاتی ہے اور لوگ جلد ہی اس سے خلاصی کی صورت چاہتے ہیں، بات ہی کے ذریعہ انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے قریب یا دور ہوتا ہے، بلکہ اخلاق کا تعلق بھی زبان سے ہے، نیکی اور بدی کی ہر بات زبان ہی سے کی جاتی ہے اور گفتگو کے ذریعہ ہی انسان کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد ✢ عیب وہنرش نہفتہ باشد

یعنی آدمی جب تک بات نہیں کرتا ہے، اس کے اندر کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے، اس کے عیب وہنر پوشیدہ رہتے ہیں اور گفتگو کے بعد ہی اس کے اچھے اور برے اخلاق ظاہر ہوتے اور سامنے آسکتے ہیں، بلکہ تمام امور بات ہی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بات کے ذریعہ کبھی تو عزت کا بلند مقام حاصل کرلیتا ہے اور کبھی نظروں سے گرجاتا ہے اور کوئی وقعت باقی نہیں رہتی ہے، بات ہی کا اثر ہے کہ آدمی اس سے خوش ہوتا ہے، اور انعام واکرام سے نوازتا ہے،

اور ایک آدمی ناراض ہوتا ہے اور لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، یہ سب باتوں ہی کا کرشمہ ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

ذیل کی تحریر میں بات سے متعلق کچھ آداب کا ذکر کیا جاتا ہے:

نرم دمِ گفتگو

اگر انسان اچھی، نرم اور میٹھی بات کرے تو یہ ایک دوسرے کے تئیں قربت کا باعث ہوتا ہے، اس سے آپس کے اختلافات اور نزاعات دور ہوتے ہیں اور بہت سے مسائل کا حل نکل سکتا ہے، جو دینی اعتبار سے بھی اجر کا باعث ہوگا اور دنیوی اعتبار سے بھی خیر کا موجب ہوگا، اس کے برخلاف اگر سخت اور کڑوی بات کی جائے تو آپس کے اختلافات بڑھ جاتے ہیں اور مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے ہی چلے جاتے ہیں، یہ دینی و دنیوی دونوں ہی اعتبار سے نقصان کا باعث ہوتا ہے، نرم بات کے ذریعہ روٹھے ہوئے دل موہ لئے جا سکتے ہیں اور سخت سے سخت دشمن بھی موافق ہو سکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بات کرنے کا سلیقہ ہو۔ بقول کلیم عاجز:

بات گرچہ بے سلیقہ ہو کلیمؔ ؂ بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

اس سلسلہ میں قرآن و حدیث سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے بات کرنے والے کو چاہئے کہ بات آہستگی کے ساتھ کرے، بے موقع بلند آواز سے اور چیخ کر بات کرنا مناسب نہیں، بلکہ یہ حماقت و بے وقوفی کی علامت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"اور اپنی آواز کو پست کرو، کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھے کی ہے"[1]۔

اسی طرح جب لوگوں سے بات کریں تو ایسی بات ہو جو دلوں کو بھائے، ایسی بات ہرگز نہ کہیں کہ جس سے دل آزاری ہو، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"اور لوگوں سے اچھی بات کہو"[2]

(۱) لقمان - ۱۹۔ (۲) البقرہ - ۸۳۔

اچھی بات ہر انسان پسند کرتا ہے اور بری باتوں سے ہر شخص نفرت کرتا ہے، اچھی بات کو غور سے سنا بھی جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، بلکہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اچھی بات کہنا صدقہ ہے"[1]۔

جب لوگوں سے بات کی جائے تو نرم انداز میں کی جائے، نرم گفتگو اثر انداز ہوتی ہے، دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث نہیں ہوتی اور مقصد برآری میں معاون بھی ثابت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف بھیجا کہ اس کو دین کی دعوت دیں اور راہِ راست پر لائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: "تم دونوں اس سے نرم بات کرنا"[2]۔

اکثر اوقات مسائل اس لئے پیدا ہو جاتے ہیں کہ بات سختی کے ساتھ کہی گئی اور نرم طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، اگر وہی بات نرم انداز میں کہی جاتی تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوتا، نرم خوئی اور دل جوئی کے ساتھ بات کرنے کی بہت تاکید آئی ہے، بلکہ اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

"بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے دل آزاری ہو"[3]۔

البتہ عورتیں جب نامحرم مردوں سے بات کریں تو لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہونے دیں کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال آئے اور نیت بگڑنے لگے، اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہراتؓ کو مخاطب کر کے تمام امت کی عورتوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ:

"(اے نبیؐ کی بیویو!) لوچ دار بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے، اس کے دل میں لالچ پیدا ہو گی اور بات کرو تو معقول اور بے لاگ بات کرو"[4]۔

یہ حکم تمام خواتین کے لئے عام ہے، اگرچہ مخاطب ازواج مطہراتؓ ہیں۔

---

(۱) بخاری شریف ۲/۸۹۰، باب طیب الکلام۔ (۲) طٰہٰ - ۴۴۔

(۳) البقرہ - ۲۶۳۔ (۴) احزاب - ۳۲۔

لایعنی بات

اسی طرح بات کرتے وقت اس کا خیال کرنا چاہیئے کہ فضول اور بکواس باتوں سے پرہیز کرے، فضول بات کرنے والے کا کوئی وقار باقی نہیں رہتا ہے اور مسلمانوں کا یہ شیوہ نہیں کہ بیکار باتوں میں اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کریں، اللہ تعالےٰ مومنوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ لوگ ایسے ہیں، جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں[1]"۔

گویا کہ لغو اور فضول باتوں سے پرہیز نہ کرنا اور بیکار اور لایعنی باتوں میں اپنے اوقات کو ضائع کرنا مسلمانوں کی شان نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بکواس اور لایعنی باتوں میں وقت گزارنے والے امت کے بدترین افراد ہیں ـــــــ جو لوگ اپنے قیمتی اوقات کو فضول باتوں میں برباد کر دیتے ہیں، ان کو اس حدیث سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور غور کرنا چاہیئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے سخت الفاظ میں فضول بات کرنے سے منع فرمایا ہے اور ایسی باتیں کرنے والوں کو بدترین امت فرمایا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں، جو بہت باتیں کرتے ہیں، بے تکان بولتے ہیں اور بے پناہ باتیں بناتے ہیں، اور میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں، جو بہترین اخلاق رکھتے ہیں[2]"۔

ہنسی کی بات

رہی بات ہنسی مذاق کی، تو ہنسنا ہنسانا انسان کا خاصہ ہے، اس سے ایک طرح کی خوش طبعی اور قلب کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور کچھ دیر کے لئے غم ہلکا ہو جاتا ہے، بلکہ

---

(۱) مومنون - ۳۔ (۲) کتابِ زندگی، ترجمۃ الادب المفرد، صفحہ ۳۶۱۔

بعض مواقع پر انسان مختلف قسم کے رنج وغم میں مبتلا ہوتا ہے اور اس طرح کی باتوں سے یک گونہ سکون و آرام محسوس کرتا ہے اور اس سے انسان کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے، لہٰذا ایسی بات کہنا جس سے سننے والے کو ہنسی آئے، اگر وہ شریعت کے دائرہ میں ہو اور اس سے کسی کی استہزا مقصود نہ ہو تو معیوب نہیں ہے، لیکن اگر اس سے کسی کی توہین اور سبکی مقصود ہو تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہنسی کی بات اور مزاح فرمانا ثابت ہے، جیسا کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ واقعہ ملتا ہے کہ:

"ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سواری کے لئے ایک اونٹ طلب کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک اونٹنی کا بچہ دوں گا، اس پر اس شخص نے مایوسی کے انداز میں کہا کہ میں بچہ کیا کروں گا؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے[1]"

اسی طرح سے یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ:

"ایک بڑھیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھ کو جنت میں داخل کرے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے فلاں کی ماں! بوڑھی جنت میں نہیں داخل ہوگی، تو وہ روتی ہوئی واپس جانے لگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہلوایا کہ بڑھیا جنت میں داخل ہوگی، لیکن وہ بوڑھی نہیں رہے گی، بلکہ جوان ہوگی، اللہ تعالیٰ بوڑھیوں کو جوان کرکے جنت میں داخل کریں گے[2]"

لیکن یہ ہنسنا ہنسانا کبھی کبھار ہونا چاہیئے، نہ کہ مستقل طور پر اسی طرح کی باتوں میں لگا رہنا چاہیئے، کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، ہنسی مذاق سے جاہل اور کمینے لوگ جری ہو جاتے ہیں، اس طرح کی باتوں سے رعب اور ہیبت اس طرح ختم ہو جاتا ہے، جس طرح لکڑی

---

(۱) ابوداؤد شریف ۲/۶۸۲، باب المزاح۔
(۲) شمائل ترمذی، صفحہ ۱۶، باب ماجاء صفۃ مزاح رسول اللہ علیہ وسلم۔

آگ سے جل کر ختم ہو جاتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زیادہ ہنسی سے بچو، اس سے دل مردہ اور چہرہ کا نور زائل ہو جاتا ہے، نیز ارشاد فرمایا کہ مذاق شیطان کی کارستانی اور نفس کا دھوکہ ہے[1]"۔

مذاق میں بھی سچ بولنا چاہیے، جھوٹ بولنا جائز نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"میں مذاق میں بھی سچ کے علاوہ کوئی بات نہیں کہتا ہوں[2]"۔

اس لئے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ سے بچنا چاہیئے اور زیادہ ہنسی مذاق میں نہیں لگنا چاہیے اس سے دل غافل ہوتا ہے، اسی لئے زیادہ ہنسنے سے منع کیا گیا ہے اور ویسے بھی یہ وقار کے خلاف ہے کہ انسان ہر وقت ہنسی مذاق کی باتوں میں لگا رہے، بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ ہنسی مذاق کی باتوں میں لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور کچھ لوگ اس کا خیال بھی نہیں کرتے کہ کس سے اور کس وقت اس طرح کی بات کرنی چاہیئے اور اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں نزاع پیدا ہو جاتا ہے اور فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان کا باعث ہوتا ہے، بسا اوقات یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ ہنسی مذاق میں ایسا واقعہ ہو گیا، اس لئے ہنسی مذاق کی بات کرتے ہوئے خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سچی بات

ایسی بات کہنی چاہیئے، جو انصاف اور سچائی پر مبنی ہو، اس میں جانب داری کا پہلو اور جھوٹ نہ ہو، قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! خدا سے تقوٰی اختیار کرو اور بات سچی کہو، اللہ تعالےٰ تمہارے کاموں کو سنوارے گا، اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا[3]"۔

اس لئے سچ بولنا چاہیئے، اس سے انسان اللہ تعالےٰ کے انعام کا مستحق قرار پاتا ہے،

---

(۱) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۳۰۱۔ (۲) ایضاً صفحہ ۳۰۲، (۳) احزاب، ۷۰۔

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو سنوار دیتا ہے، اور اس کے گناہوں کو بھی معاف فرما دیتا ہے، بات کرنے میں انصاف کو ہر حالت میں ملحوظ رکھنا چاہیے، بلکہ:

"ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی بات کہنا بہترین جہاد قرار دیا گیا ہے[۱]۔"

سچ بولنے کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے، کہ اس سے لوگوں کے دل میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور جو شخص سچ نہیں بولتا اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اور لوگ اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے، آپ کا ارشاد ہے کہ:

"سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، آدمی سچ بولتا ہے تو آدمی سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے یہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[۲]۔"

سچ بولنے سے اللہ راضی اور خوش ہوتا ہے اور جھوٹ بولنے سے ناراض اور ناخوش اور سچ بولنا اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر ہو اور واقعہ کے مطابق ہو اگر زبان سے کچھ اور کہہ رہا ہے اور نیت کچھ اور ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے، تو وہ بات سچ نہیں ہو سکتی منافقین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرتے تھے، لیکن ان کا دل مومن نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ: "وہ جھوٹے ہیں[۳]" حالانکہ وہ لوگ بظاہر سچ بولتے تھے۔ اسی طرح اگر زبان اور دل دونوں موافق ہیں، لیکن اس کا عمل مخالف ہے، تو بھی وہ سچا نہیں ہے، لہٰذا بات کرتے وقت ضروری ہے کہ دل اور عمل دونوں زبان کے موافق ہوں، اللہ کے نزدیک وہ شخص بہت برا ہے، جو کہتا کچھ اور ہے اور اس کا عمل کچھ اور ہے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، چنانچہ منافق کی تین علامتیں بیان کی گئی ہیں:

"(۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (۳) امانت میں خیانت کرے[۴]۔"

---

(۱) ترمذی ۱/۴۰، باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر، و ابوداؤد ۲/۵۹۰، باب الامر والنہی (۲) ابوداؤد ۲/۶۸۱، باب التشدید فی الکذب (۳) المنٰفقون۔ ۱ (۴) مسلم ۱/۵۶، باب خصال المنافق، والترمذی ۲/۹۱ باب فی علامۃ المنافق۔

ان تینوں علامتوں میں منافق کی سب سے پہلی اور اہم علامت جھوٹ بولنے کی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"مومن میں ہر برائی ہو سکتی ہے، لیکن خیانت اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی۔"(۱)

نیز ارشاد فرمایا کہ:

"مسلمان بزدل بھی ہو سکتا ہے، بخیل بھی ہو سکتا ہے، لیکن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"(۲)

مشہور حدیث ہے کہ قیامت کے دن امت کے تین افراد خدا کے حضور پیش کئے جائیں گے، اور ہر ایک سے سوال کیا جائے گا:

"عالم کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تیرا علم سیکھا اور تیرے بندوں کو سکھاتا، شہید کہے گا کہ دین کی خاطر تیری راہ میں اپنی جان قربان کر دی اور دولت مند کہے گا کہ اپنا مال تیری راہ میں خرچ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ ہر ایک کے جواب میں یہی کہے گا کہ تو جھوٹا ہے، تو نے علم سیکھا تاکہ عالم کہلائے اور تو نے اپنی جان دی تاکہ شہید کہلائے، اور تو نے مال خرچ کیا، تاکہ سخی کہلائے، اور یہ دنیا میں حاصل ہو چکا ہے، لہٰذا تینوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"(۳)

معلوم ہوا کہ بات تو بظاہر سچی تھی، لیکن نیت اس کے موافق نہیں تھی، جس کی وجہ سے وہ جھوٹے کہلائے اور جھوٹ کی وجہ سے وہ دوزخ کے مستحق ہوئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل کی سچائی تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور جھوٹ بولنا تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

"ایک صحابیؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ جنت میں لے جانے والا عمل کون سا ہے اور جہنم میں لے جانے والا عمل کون سا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سچ بولنا جنت میں لے جانے والا عمل ہے، اور جھوٹ بولنا جہنم میں لے جانے والا عمل ہے۔"(۴)

ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ

---

(۱) مسند احمد، ۲۵۲/۷۔ (۲) ادب الدنیا والدین صفحہ ۳۱۴۔

(۳) ترمذی، ۶۳/۲، باب ماجاء فی الریاء والسمعہ، (۴) مسند احمد، ۱۷۶/۳۔

علیہ وآلہ وسلم ! مجھ میں چار بری عادتیں ہیں ، بدکار ہوں ، چوری کرتا ہوں ، شراب پیتا ہوں ، جھوٹ بولتا ہوں ، ان میں سے جس ایک کو فرمائیں ، آپ کی خاطر چھوڑ دوں ، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جھوٹ نہ بولا کرو ۔ رات کو اس شخص نے شراب پینے کا ارادہ کیا اور پھر بدکاری کرنا چاہا ، لیکن یہ سوچ کر کہ کل صبح حضورؐ کے سامنے جھوٹ تو نہیں بول سکتا ، کیونکہ عہد کر چکا ہوں اور سچ بولنے پر سزا پاؤں گا ، اس ڈر سے وہ دونوں ہی کام نہیں کیا ، یعنی شراب پینے اور بدکاری کرنے سے رک گیا ؛ اور جب چوری کے لئے نکلا تو پھر خیال آیا کہ کل پوچھ ہوگی تو کیا جواب دوں گا ، بدعہدی تو نہیں کر سکتا ، یعنی جھوٹ نہیں بول سکتا اور سچ بولنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا ، اس لئے اس سے بھی باز رہا ، صبح کو جب خدمتِ اقدس میں حاضری ہوئی تو خوش خبری سنا دی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر انسان جھوٹ بولنا چھوڑ دے تو اس کو بری عادتوں سے نجات مل سکتی ہے ، گویا سچ نجات دلانے والی اور جھوٹ ہلاک کرنے والی عادت ہے ۔

جھوٹ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی گفتگو کے وقت اپنے ذہن میں اس بات کا استحضار رکھے کہ اس کی ہر بات لکھی جا رہی ہے اور اس کو قیامت میں اس کا حساب دینا ہے ، یہی یقین ہے جو انسان کو زبان کے گناہوں سے بچا سکتا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں :

" آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا ، مگر ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے[1] " ۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے جنت کی ضمانت دی ہے جو زبان پر کنٹرول رکھے[2] " ——— زبان پر قابو رکھنا اور ہر ایسی بات سے پرہیز کرنا ضروری ہے ، جو انصاف کے خلاف ہو ، جھوٹ ہو یا دل آزاری کا باعث ہو ، نیز جو بات کہے اس پر خود عمل کرے ، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں :

" تم کیوں کہتے ہو وہ بات جو کرتے نہیں ، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو[3] " ۔

---

(۱) قٓ - ۱۸ -　　　(۲) بخاری شریف ، ۲/۹۵۸ -

(۳) صف - ۲ -

اسی طرح سے ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق کے نہیں بیان کرنا چاہیئے، ممکن ہے کہ وہ بات جھوٹی اور بے بنیاد ہو، جو گناہ کا باعث بن جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا؛

"جو شخص ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرتا ہے، اس کے جھوٹے اور گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے"[1] ——— لہٰذا اس سلسلہ میں احتیاط ضروری ہے۔

انداز گفتگو

بات کرنے میں الفاظ کا انتخاب بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ الفاظ سادہ اور سہل ہونے چاہئیں، ایسے الفاظ نہیں استعمال کرنے چاہئیں جو مخاطب کی سمجھ سے باہر ہوں، یا سمجھنے میں دشواری یا مشکل ہو، اسی طرح سے بات ٹھہر ٹھہر کر کرنی چاہیئے اور زیادہ تیزی کے ساتھ بات نہیں کرنی چاہیئے، کیوں کہ اس طرح بات کرنے سے بسا اوقات مخاطب سمجھ بھی نہیں پاتا، اس لئے گفتگو میں ٹھہراؤ ہونا چاہیئے، بہت عجلت نہ ہو۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا"[2]۔

نیز اگر کوئی شخص تیز گفتگو کرتا تو اس سے منع فرماتی تھیں۔

"ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنا شروع کیا، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیز گفتگو نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا"[3]۔

اسی طرح بات کرتے وقت پوری توجہ مخاطب کی جانب ہونی چاہیئے، ورنہ مخاطب اس کی بے توجہی سے بات کو گراں محسوس کرے گا اور اس کے دل میں بات کی وقعت نہیں رہے گی چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ:

---

(۱) مسلم عن ابی ہریرہؓ، ابوداؤد ۲/۶۸۱ (۲) ابوداؤد ۲/۶۶۵، شمائل ترمذی ص۱۴، باب کیف کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۳) شمائل ترمذی ص۲۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات فرماتے تھے تو پوری توجہ کے ساتھ فرماتے تھے"۔(۱)

ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ بات تو ایک طرف کر رہے ہیں اور متوجہ دوسری طرف ہیں۔ بات کرتے وقت اس کی نوعیت پر بھی دھیان رکھنا چاہیئے، اگر غصہ کی بات ہے تو غصہ کا اظہار ہونا چاہیئے اور اگر خوشی کی بات ہے تو خوشی کا اظہار ہونا چاہیئے، یعنی موقع اور محل کے لحاظ سے گفتگو کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیئے، ورنہ بات کا اثر باقی نہیں رہتا اور نہ ہی توجہ باقی رہتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری طرح مسلسل تیز گفتگو نہ فرماتے، بلکہ آپ جدا جدا اور واضح گفتگو کرتے کہ پاس بیٹھنے والا اسے یاد کر لیتا، اکثر اوقات آپ ایک بات کو تین تین بار دہراتے، تاکہ خوب یاد ہو جائے اور جب آپ سلام کرتے تو تین بار سلام فرماتے، زیادہ تر خاموش رہتے، بلا ضرورت گفتگو نہ فرماتے، آپ گفتگو کا آغاز اور اختتام جبڑوں کے دہانے سے کرتے، یعنی توجہ سے بات فرماتے، جامع کلام ارشاد فرماتے، بات طویل نہ ہوتی اور نہ بے معنی حد تک مختصر، صرف اسی معاملہ میں کلام فرماتے جہاں ثواب کی امید ہوتی، جب آپ کسی بات کو پسند فرماتے تو چہرۂ انورؐ سے ظاہر ہو جاتا، لغو کلام اور زیادہ گوئی سے مجتنب تھے، اور آپ تیز کلام بھی نہ تھے، آپؐ کا ہنسنا اکثر تبسم کی حد تک رہتا"۔(۲)

گفتگو میں تکلف

بات کو خواہ مخواہ طول نہیں دینا چاہیئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے کم سے کم الفاظ میں مطلب کو واضح کر دینا چاہیئے، گفتگو میں اختصار اور جامعیت دانش مندی کی علامت ہے، چنانچہ

---

(۱) شمائل ترمذی شریف، صفحہ ۲۔

(۲) مسند احمد (کنز العمال)، ۳/۸۵، شمائل ترمذی ص۲ و ص۱۴، باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کرو، کیونکہ اختصار بہتر ہے[1]۔"

اسی طرح بات کرنے میں تکلف سے کام نہیں لینا چاہیئے اور نہ زبان کو توڑ مروڑ کر بات کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے، جو اپنی زبان کو اس طرح توڑ مروڑ کر بات کرتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کر گھاس کھاتا ہے۔ نیز فرمایا کہ جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لئے رد و بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے تو قیامت کے دن خدا اس کا فدیہ اور توبہ قبول نہ کرے گا[2]۔"

لہٰذا گفتگو میں بے جا تکلف اور مشکل اسلوب سے احتراز کرنا چاہیئے اور عمدہ اور بہتر اسلوب اختیار کرنا چاہیئے، اس سے مخاطب پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔

مخاطب کی رعایت

بات کرتے وقت مخاطب کی رعایت بھی ضروری ہے، اگر ہم بڑوں سے مخاطب ہیں تو احترام و ادب کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے، چھوٹوں سے مخاطب ہیں تو مشفقانہ انداز میں بات کرنی چاہیئے، اگر اس کی رعایت نہیں کی گئی تو تہذیب کے خلاف بات ہوگی اور لوگ بے ادب تصور کریں گے، جس کے نتیجہ میں مخاطب سے قربت کے بجائے بعد پیدا ہوگا اور مانوس ہونے کے بجائے اجنبیت کا باعث ہوگا، لہٰذا مخاطب کی رعایت کا خیال ضروری ہے، تاکہ اس سے قربت بڑھے اور مخاطب یک گونہ مانوس ہو جائے اور اجنبیت کا احساس نہ ہو پائے، خصوصاً جب کہ دوستوں سے بات کریں تو یہ ضروری ہے کہ گفتگو میں ایک حد تک بے تکلفی ہو، ورنہ کبر کا احساس ہوگا، غرض ہر شخص سے

---

(۱) ابو داؤد شریف، ۲/۶۸۳۔

(۲) ابو داؤد ۲/۶۸۳، باب فی التشدق فی الکلام۔

اس کی سطح کے مطابق بات کرنی چاہیئے، اگر مخاطب ذی حیثیت اور صاحب اقتدار شخص ہے تو اسی حیثیت سے گفتگو کرنی چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ ایک عام آدمی کی طرح اس سے بات کریں، بلکہ اس کی حیثیت کا پورا خیال کریں اور اس کے مرتبے کو کم نہ ہونے دیں اور اس کو ذلت کا احساس نہ ہونے پائے، اگر مخاطب ذی علم ہے، یا جاہل ہے تو اس کے علم کی رعایت کرتے ہوئے بات کریں، ایسا نہ ہو کہ آپ کا مخاطب جاہل ہے اور آپ اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرتے رہیں اور یہ اس کے لئے "تقاطرِ اسطار" ثابت ہو، لہٰذا مخاطب کی ہر طرح رعایت ہونی چاہیئے، چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لوگوں سے اس کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق بات کرو[1]"۔

بات کرتے وقت اگر معلوم ہو جائے کہ مخاطب کو اس طرح کی باتوں سے ناگواری ہو گی تو اس کے سامنے ایسی بات نہ کریں۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو ایسی گفتگو میں مخاطب نہ فرماتے تھے جو اسے ناگوار ہو، ایک روز ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس پر زرد رنگ کے دھبے پڑے تھے، جب وہ چلا گیا تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا، اگر یہ زرد رنگ کو بدل لیتا تو اچھا ہی تھا[2]"۔

لہٰذا مخاطب سے اس طرح کی گفتگو نہ کریں جو اسے ناگوار گزرے اور اپنے دل میں وہ بے عزتی محسوس کرے، اسی طرح اگر مخاطب ایک نہ ہو بلکہ کئی لوگ ہوں، یا ایک جماعت ہو تو ایک شخص کو مخاطب نہیں بنانا چاہیئے، بلکہ تمام لوگوں کو مخاطب کر کے بات کرنی چاہیئے، تاکہ دوسروں کی دل شکنی نہ ہونے پائے اور سب کو فائدہ پہنچے۔

"حبیب ابن ثابت کہتے ہیں کہ لوگ یہ بات پسند کرتے تھے کہ جب کوئی شخص گفتگو کرے تو ایک ہی شخص کے مقابل ہو کر نہ کہے، بلکہ ساری جماعت کو

---

(۱) ابوداؤد شریف، ۶۶۵/۲۔

(۲) کتابِ زندگی، ترجمہ الادب المفرد لامام بخاری، ص۱۳۶۔

بالعموم مخاطب کرے[1]۔"

اس لئے اگر مخاطب زیادہ ہوں تو سب کو مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کریں، بہرحال مخاطب کی رعایت ہر حال میں کرنی چاہیئے اور اس کی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے بات کرنی چاہیئے۔

گفتگو سے پہلے سلام

جب ملاقات ہو تو گفتگو کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہیئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "بات کرنے سے پہلے سلام کیا کرو[2]۔" نیز فرمایا گیا کہ: "سلام کو پھیلاؤ[3]۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلام کرنے کی اسلام میں کس قدر تاکید کی گئی ہے، سلام کرنے سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے لئے سلامتی کی ضمانت ہے، اب طرفین ایک دوسرے سے مامون ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے، سلام کرنے میں جو پہل کرے وہ افضل ہے، اب دوسرے شخص کو جواب اس سے بہتر دینا چاہیئے، یعنی اگر سلام کرنے والا "السلام علیکم" کہہ کر سلامتی کی دعا کرے تو اس کے جواب میں "ورحمۃ اللہ" کا اضافہ کرنا چاہیئے، اگر "السلام علیکم" کے بعد "ورحمۃ اللہ" اور "وبرکاتہ" کا اضافہ کیا جائے تو ثواب میں بھی اسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے، سلام کے لئے تعارف کی قید نہیں، کہ جس کو جانتا پہچانتا ہو صرف اسی کو سلام کرے، بلکہ تعارف ہو یا نہ ہو، چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اپنا ہو یا غیر ہر ایک کو سلام کرنا چاہیئے، حدیث میں آتا ہے کہ "آپ بچوں کے پاس سے گزرے، تو انہیں بھی سلام کیا[4]۔"

اگر کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو بچوں کو سلام نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ ایک دن عورتوں کی جماعت کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا[5]۔" یہ اس

---

(۱) کتاب زندگی، ترجمہ الادب المفرد لامام بخاری ص۱۳۶ (۲) ترمذی ۲/۹۹، باب السلام قبل الکلام (۳) ترمذی ۲/۹۸ ابوداؤد ۲/۷۰۶، باب افشاء السلام (۴) مسلم ۲/۲۱۳، ابوداؤد ۲/۷۰۷، ترمذی ۲/۹۹، باب ماجاء فی التسلیم علی الصبیان (باقی ص پر)

وقت ہے جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، فی زمانہ اجنبی عورتوں کو سلام کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہے اس لئے ان کو سلام نہیں کرنا چاہئے، ہاں اگر محرم ہے، یا بہت بوڑھی خاتون ہے تو اس کو سلام کیا جا سکتا ہے۔

سلام کرنے میں پہل کرنا افضل ہے، دوسروں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہم کو سلام کرے اور ہم اس کا جواب دیں، سلام کرنے میں اپنی بے عزتی یا حقارت محسوس کی جائے یہ بالکل زیبا نہیں، پھر بھی حدیث میں صراحت موجود ہے کہ کس کو سلام میں پہل کرنا چاہئے۔

"حدیث شریف میں ہے کہ چھوٹا بڑے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، سوار پیدل چلنے والے کو، تھوڑے افراد زیادہ کو سلام کریں۔"[1]

"نیز ترمذی شریف میں ہے کہ: سوار، چلنے والے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔"[2]
تاہم اگر دوسرا شخص سلام میں پہل کرے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ زیادہ ثواب کا مستحق ہے۔

سلام کرتے وقت ہاتھ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر صرف ہاتھ اٹھا کر سلام کیا جائے اور زبان سے سلام کے الفاظ ادا نہ کئے جائیں تو کافی نہیں، البتہ اگر مخاطب دور ہو، جہاں سلام کی آواز نہیں پہنچ سکتی ہو تو اشارہ سے سلام کیا جا سکتا ہے، پھر بھی اشارہ کے ساتھ سلام کے الفاظ بھی زبان سے ادا کرنا چاہئے، لہٰذا مخاطب تک آواز پہنچنے کی صورت میں آواز کے ساتھ سلام کرنا چاہئے۔

موقع اور محل کی رعایت

بات کرتے وقت موقع، محل اور حالات کی رعایت ضروری ہے، مقصد اور غرض کے اعتبار سے کلام کرنا چاہئے، اگر گفتگو سے کسی کام کی ترغیب یا شوق دلانا مقصود ہو تو باتوں میں نرمی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ (۵) ابوداؤد ۲/۷۰۶، ترمذی ۲/۹۹ باب فی التسلیم علی النساء۔

(۱) ابوداؤد ۲/۷۰۶، باب من اولیٰ بالسلام، مسلم ۲/۲۱۲، باب یسلم الراکب علی الماشی والقلیل علی الکثیر۔

(۲) ترمذی ۲/۹۹، باب ماجاء فی تسلیم الراکب علی الماشی۔

اور لطافت ہونی چاہیے اور اگر غرض ترہیب یا خوف دلانا ہو تو باتوں میں سختی اور درشتی ہونی چاہیے اس سے مقصد کے حصول میں آسانی ہوتی ہے، جہاں بات کرنی ضروری ہو وہاں پر خاموش رہنا، یا جہاں خاموش رہنا ضروری ہو وہاں بات کرنا بہتر نہیں ہے. مثلاً بیت الخلاء میں بات کرنا منع ہے، اسی طرح مسجد میں دنیا کی بات کرنے کی ممانعت ہے، خطبہ کے وقت بات کرنا بھی منع ہے، ان تمام صورتوں میں خاموش رہنا ضروری ہے، جس موقع پر وقت کی تنگی یا دیگر عوارض کی بنا پر مختصر بات کرنے کی ضرورت ہو وہاں طویل گفتگو کرنا، یا جس جگہ طویل گفتگو کی ضرورت ہو، یا وضاحتی بیان مطلوب ہو وہاں اختصار سے کام لینا، جس سے مسئلہ کی وضاحت نہ ہوسکے مناسب نہیں ہے، ہر دو صورت میں مقصد اور غرض کی تکمیل نہ ہونے سے کلام بے معنیٰ ہو جائے گا، اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ جہاں کہیں کوئی بات سنے تو دوسری جگہ اس کو نقل کردے، حدیث میں آتا ہے کہ "جو شخص ہر سنی ہوئی بات کو بیان کردے، اس کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے"(۱). ایسا شخص سچا اور قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتا جو ہر سنی ہوئی بات کو نقل کردے، ایسی بات بھی نہیں کہنی چاہیے کہ کل ہو کر معذرت کرنی پڑے، اس لئے اپنی زبان کو ہمیشہ قابو میں رکھنا چاہیے اور بغیر سوچے سمجھے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے، اگر کوئی شخص موقع اور محل کی رعایت کے بغیر ناروا طریقہ سے پیش آتا ہے اور نازیبا کلمات کہتا ہے تو ان سے سلام کرکے الگ ہوجانا چاہیے، قرآن شریف میں موجود ہے، "اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں"(۲). ایسے موقع پر ان سے الجھنا مناسب نہیں ہے، عقلمندی کی بات یہی ہے کہ سلام کرکے الگ ہوجائے، اسی میں عافیت ہے۔

کھانا کھاتے وقت نہ زیادہ باتیں کرنی چاہئیں اور نہ ایک دم خاموش ہی رہنا چاہیے، بلکہ تھوڑی گفتگو کرنی مناسب ہے، تاکہ کھانے کے حریص نہ معلوم ہوں اور زیادہ باتیں بھی نہ کریں کہ عام مجلس اور کانفرنس ہال بنادیں اور کھانے کے آداب اور وقت کی رعایت نہ ہوسکے، اگر کوئی مریض ہے تو اس کی دل جوئی اور تسلی کی خاطر کچھ باتیں کریں، تاکہ ہمدردی کا اظہار ہوسکے، اگر کوئی مہمان آجائے تو اس سے اپنائیت کی باتیں بھی کرنی چاہئیں، جس سے اس کو اجنبیت کا احساس

---

(۱) مسلم عن ابی ہریرۃؓ

(۲) فرقان، ۶۳۔

نہ ہو اور میزبان کے لئے ناگواری محسوس نہ ہو۔ اس طرح مہمان کی طبیعت لگ جائے اور وہ اپنے دل میں خوشی ومسرت محسوس کرے، اگر تین آدمی ایک ساتھ ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی کا آپس میں بات کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس سے تیسرے کو تکلیف محسوس ہوگی، ہاں اگر کوئی اہم اور راز کی بات ہو، یا تیسرے شخص سے اجازت لے کر بات کریں تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح اگر تین آدمی ہوں تو دو آدمیوں کو ایسی زبان میں بات نہیں کرنی چاہیئے جو تیسرا نہ سمجھ سکے، کیونکہ یہ بھی تکلیف کا باعث ہوگا، اگر آپ کو کسی معاملہ پر فیصلہ کرنا ہو تو جب تک دوسرے فریق کی بات نہ سن لیں، فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے، ممکن ہے کہ دوسرے فریق کی دلیل مضبوط ہو اور وہی حق بات پر ہو، جس سے فیصلہ کرنے میں انصاف سے کام لیا جا سکے، لہٰذا ان تمام صورتوں میں موقع اور محل کی رعایت کرتے ہوئے گفتگو کرنی چاہیئے۔

غیبت اور الزام تراشی

بات کرتے وقت اس کا خیال بھی ضروری ہے کہ باتوں میں کسی کی غیبت یا کسی پر بہتان تراشی یا الزام تراشی کا معاملہ نہ ہونے پائے، تاکہ معاملات اور تعلقات میں کوئی فرق نہ آسکے کیونکہ اس طرح کی باتوں سے لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہو جاتا ہے، لہٰذا ایک مومن کو چاہیئے کہ وہ بیہودہ گوئی اور فحش کلامی سے بچتے ہوئے صحیح بات کہے اور پاکیزہ الفاظ استعمال کرے، مذہب نے بدزبانی، بدگوئی اور غیبت کی باتوں سے سخت منع کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> "غیبت زنا سے زیادہ سنگین اور سخت گناہ ہے، کیونکہ زنا کا گناہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے، لیکن غیبت کرنے کا گناہ جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہو، اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا، جو شخص غیبت کرتا ہے گویا وہ اپنے چہرے اور سینے کو نوچنے اور بدنما داغ لگانے والا اور اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے والا ہوتا ہے"[1]۔

---

(۱) ابوداؤد ۲/ ۶۶۹، باب فی الغیبۃ۔

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چغل خور جنت میں نہیں داخل ہوگا۔[1]"

جب کوئی شخص غیبت کرتا ہے تو گویا وہ ایک طرح کی خیانت کرتا ہے، ستر کو پھاڑنے والا حسد اور دھوکہ دہی کی بات کرنے والا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بدگمانی، غیبت، لگائی بجھائی، ٹوہ میں لگنے اور الزام تراشی سے نفرت کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اے ایمان والو! بہت گمان سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور تم ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم اس بات کو پسند کروگے کہ کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، یقیناً تم اس سے نفرت کروگے، تو خدا کا ڈر رکھو، بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔[2]"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح کی باتوں سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

"خبردار بدگمانی کو اپنی عادت نہ بنانا، بدگمانی میں تو جھوٹ ہی جھوٹ ہوتا ہے، بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، دوسروں کے عیب نہ تلاش کرو، آپس میں بغض نہ رکھو، کسی سے روگردانی نہ کرو، اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔[3]"

اسی طرح دورخے پن کی باتوں سے منع کیا گیا ہے کہ: "کوئی شخص ایک آدمی سے ایک بات کرے اور دوسرے آدمی سے اس سلسلہ میں دوسری بات کرے، ایسا کرنے والا لوگوں میں سب سے برا ہوتا ہے۔[4]"

اس سے حالات کشیدہ ہوتے اور معاملات بگڑ جاتے ہیں، اسی لئے ادھر کی ادھر لگانے کی مذمت کی گئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیب جوئی، دورخے پن کی بات کرنے، جھگڑے

---

(۱) کتاب زندگی، ترجمہ الادب المفرد، ص۱۲۲۔ (۲) حجرات - ۱۲۔

(۳) بخاری شریف، عن ابی ہریرۃ، کتاب الفرائض۔

(۴) ادب الدنیا والدین، ص۲۹۳۔

کی بات کرنے اور چغلیاں کھانے سے سخت منع فرمایا ہے، ارشاد ہے "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے سب سے کم حیثیت اس شخص کی ہوگی، جس کی فحش گوئی اور بدزبانی کے ڈر سے لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہو"(۱)۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دورخے پن والے آدمی کو بطور سزا قیامت کے دن دو آگ کی زبان لگائی جائے گی"(۲)۔ ایسا شخص گویا اپنی باتوں سے آدمیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی آگ لگایا کرتا ہے۔

عام طور پر لوگ غیبت کرنے، الزام تراشی اور دورخے پن کی بات کرنے، اسی طرح دوسری دل آزاری کی باتوں کو معمولی بات سمجھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑا گناہ فرمایا ہے اور لوگوں کو اس کا خیال اور احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جب تم اپنی زبانوں سے ایک دوسرے کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے وہ بات کہتے تھے، جس کا تمہیں کچھ علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے، لیکن خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی"(۳)۔

لہٰذا ایسی تمام باتوں سے منع کیا گیا ہے، جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔ حضرت انس رضؓ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم خاص تھے فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی، لیکن آپؐ نے نہ کبھی مجھے ڈانٹا پھٹکارا اور نہ ہی کبھی لعنت و ملامت ہی کیا، کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کام کیوں نہیں کیا"(۴)۔

آپؐ نے بہتر اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی ہے، آپؐ نے مسلمانوں کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان تو وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں"(۵)۔ جو شخص اپنی زبان سے لوگوں کو اذیت پہنچائے یا تکلیف دے تو وہ مسلمان کہلانے کے لائق نہیں ہے، اس کے برخلاف

---

(۱) بخاری و مسلم۔ (۲) ابوداؤد ۲/۶۶۸، باب ذوالوجہین۔
(۳) سورۂ نور۔ ۱۵۔ (۴) شمائل ترمذی ص۲۳، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(۵) مسند احمد ۲/۱۶۰، بخاری ۱/۶ باب ای الاسلام افضل۔

جو شخص اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور اس کی حفاظت کرے، اس کے لئے حدیث میں جنت کی ضمانت دی گئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"اگر کوئی شخص مجھے ضمانت دے اس چیز کی جو اس کے جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور اس چیز کی جو اس کی ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی پردہ کا جسم) تو میں اس کے لئے جنت کا ضامن بنتا ہوں (۱)"

اصل بات یہ ہے کہ آج لوگ اپنی برائیوں پر نظر نہیں کرتے ہیں اور دوسروں کی غیبت، الزام تراشی اور عیب تلاشی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اگر خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو بقول شاعر دوسروں کے عیوب نکالنے کا موقع ہی نہ ملے۔ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا!!

اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے جہاں سے بے خبر ہو کر دوسروں کے جہاں کی خبر گیری کرنے کے بجائے اپنی اصلاح کریں اور غیبت، الزام تراشی اور دوسروں کی دل آزاری سے بچتے ہوئے خوش گفتاری اور خوش اخلاقی کا نمونہ پیش کریں، جس سے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔

باتوں میں قسم کھانا

بات بات پر قسم کھانا مناسب نہیں، جہاں قسم کھانا ناگزیر صورت اختیار کرلے، وہیں قسم کھائی جائے اور وہ بھی صرف اللہ کے نام یا صفات کی قسم کھا سکتا ہے، اپنے باپ دادا، یا کسی پیر یا بزرگ وغیرہ کی قسم کھانا قطعاً جائز نہیں۔

اگر کسی شخص سے تلخ کلامی ہو جائے، یا معاملات بگڑ جائیں، تو بات نہ کرنے کی قسم بھی نہیں کھانی چاہیئے، بلکہ حکمت اور بہتر انداز سے حالات کو سازگار بنانے اور معمول پر لانے کی کوشش کرنی چاہیئے، لیکن اگر کسی نے قسم کھا ہی لی کہ فلاں آدمی سے بات نہیں کروں گا تو اس کے لئے ضروری

---

(۱) بخاری، عن سہل بن سعد، کتاب الرقاق۔

ہے کہ اپنی قسم توڑ دے، اس سے بات کرلے اور قسم کا کفارہ ادا کردے، جو دس مسکینوں کو دو نوں وقت اوسط درجہ کا ایسا کھانا کھلانا ہے جو اپنے گھر میں کھاتے ہیں، یا ان کو کپڑے پہنانا ہے اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھ سکتا ہے۔[1]" نہ ناجائز اور حرام کام کرنے کی قسم کھانی چاہیئے اور نہ حلال کاموں کے نہ کرنے کی قسم کھانی چاہیئے اور اگر کسی شخص نے اس طرح کی کوئی غلط قسم کھالی ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کردے، ہاں اگر حلال چیزوں کی قسم کھالی ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیئے، لیکن اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے کی قسم کھالی اور اس کے بعد اس سے بہتر کوئی دوسرا کام نظر آئے یا مناسب سمجھے تو اس کو چاہیئے کہ وہ قسم کو توڑ کر بہتر کام کو انجام دے اور قسم کا کفارہ ادا کردے[2]۔" عام حالات میں قسم کھانے سے بچنا چاہیئے۔

گفتگو کے مختلف آداب

جب بات کرے تو بڑائی نہ جتائے اور ڈینگیں نہ ہانکے، یا کسی کی تعریف کر رہا ہو تو مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے، بلکہ وہی بات کہے جو صفت اس کے اندر موجود ہو اور اس کا وہ اہل ہو تعریف میں زیادتی نہ ہو اور بڑائی کو حد سے زیادہ بیان نہ کرے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے[3]" اس لئے کہ ممدوح جس تعریف کا مستحق نہیں ہے، اگر مبالغہ سے کام لیتے ہوئے حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو یہ جھوٹ کہلائے گا اور ایک طرح سے اس کی استہزاء سمجھی جائے گی۔ اسی طرح سے جب بات کرے تو ایسی کرے جس کو پورا کرنے کا ارادہ ہو، اگر ایسی بات کرتا ہے جس کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں ہے، تو یہ بھی جھوٹ میں شمار ہوگا، اس لئے جب بات کرے تو سچی کرے، جس کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اور ایسا وعدہ کرے جس کو انجام دے سکے ورنہ

---

(۱) سورۂ مائدہ، ۸۹۔

(۲) ترمذی ۱/۲۷۹۔ باب فیمن حلف علی یمین فرای غیرہا خیرا منہا۔

(۳) ابوداؤد، ۲/۶۶۲، باب فی کراہیۃ التمادح۔

وہی چڑے والی بات ہو گی جو اسی سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان بن داؤد کا گزر ایک چڑیا (عصفور) پر ہوا جو ایک چڑی کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ چڑا اس چڑی سے کیا کہہ رہا ہے؟ ساتھیوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے نبی! ہم کچھ نہیں جانتے کہ کیا بات ہو رہی ہے، حضرت سلیمانؑ (جو پرندوں کی بولیاں جانتے، پہچانتے اور ان کی باتوں کو سمجھتے تھے) نے کہا کہ وہ اپنے دل میں بڑائی جتاتے ہوئے چڑی سے کہہ رہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کر لو میں تم کو دمشق کے جس مکان میں کہو گی رکھوں گا حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ چڑا جھوٹ بول رہا تھا، اس لئے کہ دمشق کے مکانات پتھروں کے بنے ہوئے ہیں، وہاں رہائش ممکن نہیں ہے، لیکن ہر بڑائی جتانے والا جھوٹا ہے[1]۔ گویا کہ چڑا ایسی بات کا وعدہ کر رہا تھا جس کا یقین تھا کہ وہ اس کو پورا نہیں کر سکے گا، لیکن اپنے فائدے کی خاطر ایسی گفتگو کر رہا تھا۔

بات کرتے ہوئے ہمیشہ جھوٹ سے بچنا چاہیئے اور سچ کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے چاہے اس میں نقصان ہی نظر آئے، کیونکہ اس کا انجام بہتر ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> "سچائی کو اختیار کرو اگرچہ اس میں ہلاکت نظر آئے، اس لئے کہ (انجام کار) اس میں نجات ہے، اور جھوٹ سے اجتناب کرو اگرچہ اس میں نجات معلوم ہو، اس لئے کہ اس میں ہلاکت ہے[2]۔"

لیکن اگر خدا نخواستہ ایسا موقع پیش آجائے جہاں پر جھوٹ بولنا ناگزیر ہو تو ایسی صورت میں جھوٹ نہ بولے، بلکہ توریہ سے کام لے، یعنی ایسی بات کرے کہ مخاطب کچھ اور سمجھے اور بات کرنے والا کچھ اور مراد لے، مخاطب کا ذہن مرادی معنیٰ کی طرف منتقل نہ ہو، حدیث شریف میں اس طرح کے واقعات ملتے ہیں، ایک نووارد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے سوال کیا کہ آپؐ کس سے ہیں (یعنی آپؐ کا تعلق کس قبیلہ اور خاندان سے ہے؟) ــــــ تو

---

(۱) کتاب الدنیا والدین ص۳۴۰ (۲) ایضاً ص۳۱۷۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا ماء (پانی) سے، اس شخص نے ماء کو قبیلہ سمجھا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تخلیقِ انسانی کو بتانا تھا، آپؐ نے اس طرح کے غیر ضروری سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور توریہ سے کام لیتے ہوئے ایک حقیقت کی طرف توجہ کو مبذول کیا، اس طرح جھوٹ کا ارتکاب بھی نہیں ہوا اور مقصد بھی حاصل ہو گیا۔ دوسرا واقعہ اسی جگہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے، کہ ہجرت کا موقع ہے، حضرت ابو بکرؓ ہمراہ ہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ دشمن آپؐ کی تلاش میں ہیں، آپؐ کو گرفتار کر کے لانے والوں کے لئے انعام کا اعلان ہو چکا ہے، بڑے بڑے جغادری اور اسلام کے دشمن انعام کی لالچ میں آپؐ کی تلاش میں سرگرداں ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ جو آپؐ کے یارِ غار ہیں، اپنی جان کو آپؐ پر فدا کرنے والے ہیں، آپؐ پر کسی قسم کی اذیت پہنچنا گوارہ نہیں کر سکتے، آپؐ کی حفاظت کے لئے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں، راستے میں ایک آدمی سے ملاقات ہوتی ہے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانتا تھا، لیکن حضرت ابو بکرؓ سے آشنا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اشارہ کر کے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ یہ میرے رہبر ہیں، مجھ کو راستہ دکھاتے ہیں۔ اس آدمی نے یہی سمجھا کہ کوئی راستہ بتلانے والا شخص ہے، اس نے ظاہری معنیٰ ہی سمجھا، جب کہ حضرت ابو بکرؓ کی مراد اس سے ہدایۃ الطریق نہیں، بلکہ ہدایۃ سبیل الخیر تھی[1]۔ عشقِ نبویؐ سے سرشار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے موقع اور حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے توریہ سے کام لیا، تاکہ کسی طرح کے نقصان اور اندیشے سے بچا جا سکے، اس طرح سے کہ جھوٹ بھی نہ ہو اور مقصد بھی پورا ہو جائے، جن جگہوں پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے ان جگہوں پر بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، یعنی توریہ اور تاویل سے کام لینا چاہیئے، تاکہ مقصد کی تکمیل بھی ہو جائے اور جھوٹ کا گمان بھی نہ ہو، اسی طرح اگر قبیح یا فحش بات ہو تو اس سے بھی بچنا چاہیئے، اور صراحت کے بجائے کنایہ اور اشارہ سے کام لے، تاکہ زبان محفوظ رہے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے، بلکہ قبیح اور فحش بات کے سننے سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔

اگر بات کرتے ہوئے کوئی مثال دینے کی ضرورت پڑ جائے اور کلام کو وضاحت کے ساتھ بیان

---

(۱) کتاب الدنیا والدین صفحہ ۳۱۹۔

کرنا ہو تو کمینہ پن اور ذلیل آدمیوں کی باتوں سے مثال دینے کے بجائے علماء، اور ادباء کے کلام کی مثال دینا چاہیے اور مثال بھی ایسی ہو جو بالکل واضح ہو اور آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے، سننے کے بعد دل میں اتر جائے اور اثر انداز بھی ہو، مثال ایسی ہو جو موقع اور محل کے بالکل موافق ہو اور اس کے ذریعہ بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اسی طرح اگر باتوں میں کسی تشبیہ کی ضرورت پیش آجائے اور بات کا ہم مثل اور اس جیسا بتانا مقصود ہو تو ایسے موقع پر بھی قبیح اور رذیل تشبیہ نہ دے، جس کو لوگ سننا پسند نہیں کرتے ہیں اور نہ ایسی رکیک تشبیہ دے جس کو لوگ سمجھ بھی نہ سکیں، تشبیہ ایسی ہو جو صحیح ہو، پہلے سے معروف ہو اور بات کے موافق ہو، سنتے ہی فوراً سمجھ میں آجائے، اور سننے والے کے مناسب حال ہو، تاکہ کلام زیادہ مؤثر اور عمدہ ہو سکے، اس کے معانی اور مفہوم کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو سکے، اسی اگر بات میں شعر کہے تو عام گفتگو کی طرح شعر بھی اچھے اور برے ہوتے ہیں، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "شعر بھی کلام کی طرح ہے، جو اس میں سے بہتر ہے، بہتر ہے اور جو بدتر ہے بدتر گفتگو کی طرح ہے"۔[1]

جب بات کرے تو سوچ سمجھ کر کرے، ایسا نہ ہو کہ زبان پر جو بات آجائے بغیر سوچے سمجھے کہہ دے اور بعد میں پچھتانا پڑے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

"عقلمند کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے، جب وہ بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو دل سے رجوع کرتا ہے اگر وہ دل کو پسند ہوتی ہے تو بات کہتا ہے اور اگر اس کو ناپسند ہوتی ہے اور گراں بار ہوتی ہے تو اس سے رک جاتا ہے اور جاہل آدمی کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے، جو کچھ زبان پر آتا ہے، بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہے"۔[2]

جب بات کرے تو مختصر کرے، خواہ مخواہ کلام کو طول دینا مناسب نہیں ہے، بعض حکماء کا قول ہے کہ کلام کی کثرت گناہوں کی کثرت کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح جب دوسروں کے کلام کو نقل کرے تو جو بات نقل کرنے کے لائق ہو، صرف اسی کو نقل کرے، ہر بات کو نقل کرنا خیانت ہے۔

---

(۱) کتاب زندگی، ترجمہ الادب المفرد ص ۲۵۴۔

(۲) الادب الدنیا والدین ص ۳۳۳۔

کیونکہ یہ بھی ایک طرح کی امانت ہوتی ہے، اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے[۱]۔

اسی طرح عشاء کے بعد بات نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جتنی جلدی ہوسکے عشاء کی نماز کے بعد سو جائے تاکہ صبح جلد بیدار ہوسکے اور فجر کی نماز باجماعت ادا کر سکے، اگر عشاء کے بعد باتوں میں لگ جائیں، اور سونے میں تاخیر ہو جائے تو صبح اٹھنے میں دشواری ہو سکتی ہے اور نمازِ فجر کے فوت ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لئے عشاء کے بعد جلد سونے اور باتوں میں نہ لگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد بات کرنے کو منع فرمایا ہے[۲]۔ لہٰذا عام حالات میں عشاء کے بعد بات نہیں کرنی چاہیے، بلکہ جلد سو جانا چاہیے، لیکن اگر کوئی اہم اور ضروری بات ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

بات کرتے وقت بڑے آدمی کو ابتداء کرنے کا موقع دینا چاہیے، بڑوں کی موجودگی میں چھوٹا بات نہ کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے، جو مسلمانوں کی طرح ہے؟ ہمیشہ پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہے اور پتوں میں پھل کو چھپاتا نہیں، میرے دل میں آیا کہ ایسا درخت تو کھجور کا ہے، میں نے بولنا پسند نہیں کیا، کیونکہ وہاں پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے، جب دونوں نہ بولے تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے، جب میں وہاں سے نکلا تو ابا جان سے کہا کہ میرے دل میں آیا تھا کہ یہ کھجور کا درخت ہے، کہا کہ تم کو بولنے سے کون روکتا تھا، اگر تم کہہ دیتے تو مجھے یہ بات بہت پسند آتی، میں نے کہا کہ آپ اور حضرت ابوبکرؓ تو بولے ہی نہیں تو مجھے بولنا اچھا نہ معلوم ہوا[۳]۔ یہ تھا بات کرتے وقت بڑوں کا ادب۔

جب بات کرے تو لعن طعن نہ کرے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ حضورؐ نے فرمایا کسی مومن کو نہیں چاہیے کہ وہ لعنت کرنے والا ہو، حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ بے حیائی کرنے والے اور بے حیائی کی باتیں

---

(۱) ابوداؤد ۲/۶۶۸۔ (۲) طبرانی عن ابن عباسؓ۔

(۳) کتابِ زندگی، ترجمہ الادب المفرد ص۱۳۰۔

ڈھونڈنے والے کو پسند نہیں کرتا اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ بازاروں میں چیخا جائے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک یہودی نے آپؐ کو السلام علیکم کی جگہ السام علیکم کہا، جس کے معنیٰ ہیں تم پر تباہی ہو اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، تم پر بھی تباہی ہو، اللہ کی لعنت اور غضب ہو، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عائشہ! ٹھہرو، تمہیں نرمی اختیار کرنی چاہیے، سختی اور فحش کلامی سے پرہیز کرو[1]"۔

اسی طرح بات کرتے وقت برے القاب سے نہیں پکارنا چاہیے، اسی نام سے پکارنا چاہیے اسی نام سے مخاطب کرنا چاہیے، جو اسے سب سے زیادہ پسند ہو، حنظلہ بن حزیمؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ پسند تھا کہ کسی شخص کو اسی نام اور کنیت سے مخاطب کیا جائے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہو[2]"۔

اسی طرح جب کسی کو مشورہ دے تو صحیح مشورہ دے، غلط مشورہ دینا خیانت ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری طرف منسوب کرکے ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی ہے، اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے اور جس نے اپنے مسلمان بھائی کو ایسا مشورہ دیا جو صحیح نہیں ہے، اس نے خیانت کی[3]"۔

الغرض بات کرتے وقت اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں بہترین اخلاق کی تکمیل ہی کے لئے خدا کی طرف سے نبی بناکر بھیجا گیا ہوں[4]"۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ خود کبھی فحش بولتے تھے اور نہ کسی کی فحاشی کی کھوج لگایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم میں بہترین وہ لوگ ہیں، جو حسنِ اخلاق رکھتے ہیں[5]"۔ حضرت ابودرداؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میزان (حشر) میں حسنِ اخلاق سے زیادہ وزنی اور کوئی چیز نہ ہوگی[6]"۔

---

(۱) کتاب زندگی ترجمہ الادب المفرد ص۱۳۰۔ (۲) ایضاً۔ ص۲۴۵۔

(۳) ایضاً، ص۱۱۰۔ (۴) ایضاً، ص۱۱۳۔

(۵) ایضاً، ص—— (۶) ایضاً، ص——

یعنی سب سے زیادہ وزن حسن خلق کا ہوگا۔"[1] گویا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز اور قیامت میں سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں گے۔

چونکہ اخلاق اور کردار کا پتہ باتوں کے ذریعہ ہی چلتا ہے اور انسان کے اچھے اور برے ہونے کی تمیز اس کے کلام سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اس کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے، اس لئے بات کرتے وقت گفتگو کے ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ مقصد کے حصول میں آسانی ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے بھی مستحق ہوں اور دین و دنیا میں کامیابی اور سرخروئی نصیب ہو۔

---

(۱) ابوداؤد ۲/۶۶۱۔

بدر الحسن قاسمی

انسانی دودھ کے بینک کا مسئلہ؟

میڈیکل سائنس کے میدان میں غیر معمولی ترقی ہونے کے باوجود طبی دنیا نومولود بچہ کے لئے ماں کے نیچرل دودھ کا ایسا بدل فراہم کرنے سے ابتک قاصر ہے جو بچہ کی نشو و نما کے لئے درکار ان تمام ضروری عناصر پر مشتمل ہو جو قدرت نے ماں کے دودھ میں رکھے ہیں، بچہ کی جسمانی نشو و نما اور تقویت کے ساتھ اس کی عقلی و نفسیاتی سلامتی کے لئے خدا نے نیچرل انسانی دودھ میں بعض ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو مصنوعی دودھ اور بچوں کے لئے دستیاب دوسری غذاؤں میں ابتک پیدا نہیں کی جا سکی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کے ماتحت عالمی صحت کے ادارے نے اطباء کی متفقہ قرارداد کے مطابق تمام دنیا کی ماؤں کو بچوں کی پرورش میں مصنوعی دودھ سے امکانی حد تک بچنے کی تلقین کی ہے اور تمام طبی اداروں کو اس کی پابندی کرانے پہ زور دیا ہے، چنانچہ جس طرح سگریٹ کی ہر پیکٹ پہ اس کے مضر صحت ہونے کا اعلان ہوتا ہے اسی طرح مصنوعی دودھ کے ہر ڈبہ پہ اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ بچہ کے لئے ماں کے دودھ کا کوئی بدل نہیں ہے۔

بعض حالتوں میں ماں اگر بچہ کو اپنی صحت کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اپنا دودھ نہ پلا سکتی ہو تو شریعت نے اس کے لئے "رضاعت" کا باب کھلا رکھا ہے جس کی روسے ایک عورت دوسرے کے بچہ کو معاوضہ لیکر یا بغیر معاوضہ اپنا دودھ پلا سکتی ہے، قدیم عرب معاشرہ میں "رضاعت" کا عام رواج تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بچپن میں دودھ پینے کے لئے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالے کئے گئے تھے، جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اسلام نے ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہونے کی حیثیت سے اسے باقی رکھا ہے اور اس کے لئے اصول وضوابط متعین کئے ہیں اور دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچّہ کے درمیان ایک مقدس رشتہ قائم کردیا ہے اور دونوں کے لئے اس رشتہ کی ویسی ہی عظمت وحُرمت قائم کردی ہے جو حقیقی ماں اور اس کے بچّہ کے درمیان ہوتی ہے چنانچہ ازدواجی رشتہ رضاعی (دودھ پلانے والی) ماں اور دودھ شریک بھائی بہن سے بھی اسی طرح ناجائز قرار دیا گیا ہے جس طرح حقیقی ماں اور حقیقی بھائی بہن وغیرہ سے ناجائز ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہے: وَاُمَّھٰتُکُمُ اللّٰتِیْ اَرْضَعْنَکُمْ وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ "(تمہارے لئے) تمہاری وہ مائیں بھی (حرام کی گئیں) جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور وہ بہنیں بھی جو دودھ میں شریک رہی ہیں" (سورۂ نساء آیت: ۲۲)

اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب" (رواہ الشیخان عن عائشةؓ) "رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے ہوا کرتے ہیں"

چنانچہ دودھ پینے اور پلانے کے احکام اسلامی فقہ کا ایک اہم ترین باب شمار ہوتے ہیں، حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت کو رضاعی ماں بنانے سے جو پابندیاں لازم آتی ہیں اور رضاعی ماں اور بچہ اور دودھ شریک بھائی بہنوں کے درمیان جو جسمانی و جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اس کی اسلام نے بڑی اہمیّت رکھی ہے اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس کے آداب وحقوق کی پوری رعایت کی ہے، شریعت کے بُنیادی مقاصد میں جس طرح جان، مال، انسانی عقل اور دین کی حفاظت ہے اسی طرح نسب کی حفاظت بھی ہے.

موجودہ مغربی تہذیب کی بنیاد چوں کہ مادہ پرستی پر ہے، اس لئے اس میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، چنانچہ قدرت نے علم و تحقیق کے میدان میں جن بلندیوں سے انسان کو نوازا ہے، اخلاقی حیثیّت سے تہذیب کے دعویداروں نے اپنے آپ کو اسی قدر پستی میں ڈال لیا ہے، جس کی وجہ سے علم و تحقیق کا رخ بھی صحیح نہیں رہا اور وہ بھی معاشرہ میں بے حیائی، اخلاقی بے قیدی اور

دوسرے مزمن امراض پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہیں جن کی ایک سے ایک حیا سوز مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں، عورتوں کے دودھ اور انسانی مادۂ تولید کے بینک قائم کرنے کا تخیل اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود جو نتائج ان تجربات کے سامنے آرہے ہیں ان سے آنکھیں بند کرلینا کسی طرح مناسب نہیں ہوگا، جب ہماری خواہش اور ارادے اور پسند و ناپسند سے قطعِ نظر دنیا میں کوئی چیز رائج ہوتی ہے تو اس میں مسلمان بھی اسی طرح مبتلا ہوتے ہیں جس طرح دوسری قوموں کے افراد۔ اس لیئے اس کے بارے میں شرعی احکام کی وضاحت ضروری ہے تاکہ لوگ حلال و حرام کی تمیز نہ کھو بیٹھیں، اس سلسلہ میں اصول یہ ہونا چاہیئے کہ جو چیزیں ناجائز اور حرام کے تحت جواز کے دائرہ میں آتی ہیں ان میں غیر ضروری شدّت نہ برتی جائے اور جو چیزیں ناجائز اور حرام ہیں ان کی بغیر کسی مداہنت اور مرعوبیّت کے وضاحت کی جائے۔

انسانی دودھ کا بینک قائم کرنے کا تخیل چاہے جن مقاصد کے تحت سامنے آیا ہو لیکن اس کی مصلحت یہ ظاہر کی گئی ہے کہ اس کا مقصد ضرورتمندوں کی اعانت ہے چنانچہ مغربی ممالک میں بعض رفاہی ادارے دودھ دینے والی عورتوں سے نادار بچوں کے نام پہ دودھ کا چندہ اکٹھا کرتے ہیں اور ان میں بعض کیمیائی تبدیلی کر کے اسٹاک کر لیتے ہیں اور اس دودھ سے ان بچّوں کی پرورش کا کام لیا جاتا ہے جو ناقص الخلقت ہیں یا اور یا جن کا وزن کم ہو، یا ان میں کوئی اور ایسی خرابی ہو، جس کی وجہ سے وہ مصنوعی دودھ کا تحمل نہ کر سکتے ہوں، خاص طور پہ اس کا تجربہ امریکہ میں کامیابی کے ساتھ کیا گیا اور وہ چیز وجود میں آئی جسے "انسانی دودھ کا بینک" کہا جاتا ہے۔

ظاہر نظر میں تو یہ ایک کارِ خیر معلوم ہوتا ہے جس سے مقصد بھی ایسے بچّوں کی اعانت ہے جو کمزور اور ناتمام حالت میں پیدا ہوئے ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اجازت ہوگی کہ عورتوں کا دودھ اکٹھا کر کے MILK BANK قائم کیئے جائیں؟ اور اگر عطیہ سے وافر مقدار میں دودھ حاصل نہ ہو سکے تو اس

کی خرید و فروخت بھی کی جائے اور معاوضہ دے کر دودھ اکٹھا کیا جائے؟ پھر جو بچے سیکڑوں انجان عورتوں کے مخلوط دودھ سے پرورش پائیں گے کیا ان کے درمیان رضاعت کا رشتہ بھی قائم ہوگا؟ اگر ہوگا تو اس کا فیصلہ کس طرح ہو سکے گا کہ معاشرہ کی کونسی عورت کس کی رضاعی ماں ہے اور کونسی رضاعی بہن؟ بچہ جس معاشرہ میں پلا اور بڑھا ہے، بڑا ہونے کے بعد اسی معاشرہ کی کسی عورت کو کس طرح وہ اپنے لئے شریکِ حیات کے طور پر منتخب کر سکے گا جب کہ نہ تو دودھ دینے والیوں کا ریکارڈ ہو اور نہ پینے والے بچوں کا؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ "رضاعت" کو اسلام نے حرمت کے لئے بنیاد قرار دیا ہے، اس لئے جہاں یہ بنیاد پائی جائے گی وہاں دودھ کے رشتے قائم ہوتے جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ بچہ نے عورت کا دودھ شیرخوارگی کی عمر میں پیا ہو۔

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور جمہور فقہاء نے شیرخوارگی کی مدت میں بچہ کے پیٹ میں دودھ کے پہنچنے کو حرمتِ رضاعت کے لئے کافی سمجھا ہے، خواہ بچہ کو متعارف طریقہ پر عورت کے سینہ سے حلق کے ذریعہ پلایا گیا ہو، یا اس کی ناک کے ذریعہ دودھ چڑھایا گیا ہو، بلکہ بعض نے تو حقنہ کے ذریعہ معدہ تک دودھ پہنچانے کو بھی (شیرخوارگی کے ذریعہ قائم ہونے والے رشتہ کے لئے) کافی قرار دیا ہے۔

اس کے برخلاف امام لیث بن سعدؒ، امام ابن حزمؒ اور دوسرے اصحابِ ظواہر اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ نے حرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ بچہ متعارف طریقہ پر عورت کی چھاتی سے دودھ پیے ورنہ رضاعت کا رشتہ قائم نہیں ہوگا اور اس پر وہ شرعی احکام مرتب نہیں ہوں گے۔

اس قول کو بنیاد بنا کر بعض معاصر اہلِ قلم نے انسانی دودھ کا بینک قائم کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور بینک کا مخلوط دودھ استعمال کرنے کی صورت میں حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے (۱)۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ان فقہی جزئیات کا بھی سہارا لیا ہے جن

---

(۱) میرا اشارہ "فقہ الزکاۃ" کے مصنف ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی طرف ہے، جنہوں نے (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

میں شک پیدا ہو جانے کو حرمتِ رضاعت قائم ہونے سے مانع قرار دیا گیا ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہؒ اپنی کتاب "المغنی" میں فرماتے ہیں:۔

واذا وقع الشك فی وجود الرضاع او فی عدد الرضاع المحرم هل كملا اولا؟ لم يثبت التحريم لان الاصل عدمه فلا يزول بالشك۔ كما لو شك فی وجود الطلاق وعدده۔ (۱)	جب رضاعت یا اس کی مقدار کے بارے میں شبہ واقع ہو جائے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی کیوں کہ اصل حرمت کا نہ ہونا ہے تو شک کی وجہ سے حلت ختم نہیں ہوگی، جس طرح کہ طلاق یا اسکی تعداد کے بارے میں شک ہو جانے کا مسئلہ ہے۔

اسی طرح فقہ حنفی کی کتاب "الاختیار" میں ہے:۔

امراة ادخلت حلمة ثديها فی فم رضيع، ولا يدری ادخل اللبن فی حلقه ام لا؟ لا يحرم النكاح وكذا صبية ارضعها بعض اهل القرية ولا يدری من هی فتزوجها رجل من اهل تلك القرية يجوز، لان اباحة النكاح اصل فلا يزول بالشك۔ قال: ويجب على النساء	اگر کسی عورت نے اپنی چھاتی بچّہ کے منھ میں ڈالدی ہو اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دودھ بچّہ کے حلق میں داخل ہوا یا نہیں تو اس سے حُرمت ثابت نہیں ہوگی، اسی طرح اگر کسی بچّی نے گاؤں کی ایک یا چند انجان عورتوں کا دودھ پی لیا ہو اور تعیین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کس کس کا دودھ پیا ہے تو اس گاؤں کے کسی آدمی کا اس لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا، کیوں کہ محض شبہ کی بنیاد پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ):۔ بڑے شد و مد سے یہ موقف اختیار کیا ہے، ان کی رائے سے تفصیلی آگاہی کے لئے دیکھئے کویت میں منعقد ہونے والے سمینار میں "بنوک الحلیب" کے نام سے پیش کردہ ان کا مقالہ مشمولہ "الانجاب فی ضوء الاسلام"، ص ۵۰ ــــــ ۵۷۔

(۱) المغنی مع الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۱۹۴۔

ان لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورة فان فعلن فلیحفظنه اویکتبنه احتیاطاً۔ (۱)

نکاح کی حلت ختم نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ بے ضرورت عورتیں ہر بچے کو دودھ نہ پلایا کریں، اور پلائیں تو اسے یاد رکھیں یا لکھ لیا کریں احتیاطاً۔

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:۔

اما لو شک فیه بان ادخلت الحلمة فی فم الصغیر و شکت فی الارتضاع لا یثبت الحرمة بالشک وهو کما لو علم ان صبیة ارضعتها امرأة من قریة ولا یدری من هی فتزوجها رجل من اهل تلك القریة صح لانه لم یتحقق المانع من خصوصیة امرأة۔

اگر دودھ پلانے کے بارے میں شک واقع ہو جائے اس طرح کہ عورت اپنی چھاتی تو بچے کے منہ میں رکھے لیکن بچے کے دودھ پینے یا نہ پینے کے بارے میں اسے شک واقع ہو جائے تو شک سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، یہ ایسا ہی ہے کہ کسی بچی کو گاؤں کی کسی عورت نے دودھ پلایا ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کون ہے پھر اسی گاؤں کے کسی مرد نے اس لڑکی سے نکاح کر لیا ہو تو یہ جائز ہوگا کیوں کہ عورت کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے نکاح سے مانع امر متحقق نہ ہو سکا۔

والواجب علی النساء ان لا یرضعن کل صبی من غیر ضرورة واذا ارضعن فلیحفظن ذلك ویشهرنه ویکتبنه احتیاطاً۔ (۲)

لیکن عورتوں پہ یہ واجب ہے کہ ہر بچے کو بے ضرورت دودھ نہ پلایا کریں اور اگر پلائیں تو اسے محفوظ رکھیں اور قوموں میں مشہور کر دیں اور احتیاطاً لکھ بھی لیا کریں۔

---

(۱) الاختیار لابن مودود الحنفی، ج ۳ ص ۱۳۰۔

(۲) فتح القدیر، ج ۳ ص ۳۰۴ ــــ ۳۰۵۔

لیکن ہماری رائے میں عورتوں کے دودھ کے بینک کا قیام اسلامی رُوح اور اسلامی معاشرہ کی اسپرٹ کے منافی ہے، اس لئے اسلامی ملکوں میں اس طرح کے بینک کے قیام کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں ہونی چاہیے، ضرورتمند بچّوں کے لئے دودھ پلانے والی عورتوں کی فراہمی ہی انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اُجرت لے کر دودھ پلانے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے، اس لئے دودھ کا چندہ اکٹھا کر کے بینک قائم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، ایک طرف تو غیر فطری عمل ہونے کی وجہ سے عورتوں میں اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف صحت کے لحاظ سے اس کے مُضر اثرات کا بھی تجربہ ان مُلکوں میں ہو چکا ہے جہاں سے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ پھر نادار بچّوں کے لئے بینک کے دودھ کی لاگت اتنی زیادہ ہوتی ہے جس کا تحمّل بھی جو صحیح معنوں میں ضرورتمند بچّے ہیں، وہ نہیں کر سکتے۔ پھر بچّہ کو ماما بھی نہیں ملتی جو براہِ راست دودھ پینے کی صُورت میں حاصل ہوتی ہے اور جس کا بچّہ کی عقلی و نفسیّاتی سلامتی پہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مغربی ممالک میں بھی اب اس سلسلہ میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا جو شروع میں تھا، اس لئے اسلامی دنیا میں اس کی نقّالی ایک غیر ضروری عمل ہے، جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

جہاں تک بینک کے اس مخلوط دودھ کے استعمال سے حرمتِ رضاعت کے ثابت ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ہے تو فقہ کی کتابوں میں مذکورہ بالا جزئیات سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ حکم بھی مذکور ہے کہ:

واذا اختلط لبن امرأتين	اور جب دو عورتوں کا دودھ باہم مل جائے
تعلق التحريم باغلبهما	تو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق حرمت
عند ابي يوسف وبه قال	اس عورت کے ساتھ قائم ہوگی جس کا
الشافعي وقال محمد	دودھ زیادہ اور غالب ہو، امام شافعیؒ
تثبت الحرمة منهما	بھی یہی کہتے ہیں اور امام محمدؒ فرماتے ہیں
جميعًا وهو قول زفر وعن	کہ دونوں سے حرمت ثابت ہو جائیگی۔

ابی حنیفۃ قولان.	اور امام زفرؒ کا قول بھی یہی ہے۔ امام
ووجہ قول محمد	ابو حنیفہؒ سے دونوں طرح کے اقوال منقول
ان الجنس لا یغلب جنسہ	ہیں.
فلا یستھلک فلم یکن	امام محمدؒ کے قول کی عقلی بنیاد یہ ہے
شئی منھما تبعاً للآخر	کہ جنس خود اپنی جنس پر غالب نہیں ہوا کرتا
فیثبت التحریم من کل	اس لئے مغلوب عنصر ختم نہیں ہو جائیگا
منھما استقلالاً.	اس لئے مقدار میں کمی اور زیادتی کے باوجود
(۱)	کوئی بھی دوسرے کے تابع نہیں ہوگا
	لہٰذا دونوں سے مستقل طور پہ حرمت ثابت
	ہو گی.

گو کہ بینک کے دودھ میں اگر دودھ دینے والی عورتوں اور پینے والے بچوں کا باقاعدہ ریکارڈ نہ رکھا گیا ہو تو اسی طرح کا شبہ اور جہالت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ذکر اوپر کی مثالوں میں گذر چکا ہے۔ اس لئے انجان عورتوں اور بچوں کے درمیان حرمتِ نکاح کا فتوی تو نہیں دیا جا سکتا لیکن شبہ سے بچنا بھی شرعاً مطلوب ہے۔ اس لئے اس بارے میں احتیاط ضروری ہے۔

وَاللّٰہُ اَعلَمُ بِالصَّوَاب۔

(۱) فتح القدیر، ج ۳ ص ۳۱۷۔

خالد سیف اللہ رحمانی

حدیث کے مقبول و نامقبول ہونے کے اصول

حنفی نقطۂ نظر

یہ مقالہ "انٹرنیشنل امام ابو حنیفہؒ کانفرنس" اسلام آباد منعقدہ ۵ / تا ۸ / اکتوبر ۱۹۹۸ء میں پیش کیا گیا ——— (ادارہ)

اسلامی عہد میں سب سے پہلے جو شہر بسایا گیا وہ بصرہ و کوفہ ہے، صحابیِ رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی خواہش پر خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بابت فرمان جاری کیا، یہ وقت تھا کہ فارس کا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آچکا تھا اور قادسیہ کی تاریخی جنگ نے پورے مشرق پر اسلام کی سربلندی اور اہلِ اسلام کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا نقش ثبت کر دیا تھا، مسلمان اولاً مدائن میں فروکش ہوئے، مگر مسلمانوں کو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور بقول طبریؒ اس ناموافق آب و ہوا سے متاثرین میں چالیس ہزار کی تعداد صرف ان نفوسِ قدسیہ کی تھی جو پیغمبر اسلامؐ کی صحابیت سے مشرف تھے[1]۔ اس باعث ایک نئے شہر کی تعمیر و آبادکاری کا منصوبہ بنا اور "کوفہ" کے نام سے دریائے فرات کے ساحل پر یہ نیا شہر آباد ہوا، حضرت سعدؓ کے حکم پر حضرت حذیفہؓ اور سلمان بن زیاد نے مقام کا انتخاب کیا اور نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر گریہ و زاری کے ساتھ دعا فرمائی کہ پروردگار! کوفہ کو ہمارے لئے مبارک اور قیام و استقرار کی جگہ بنا: بارك لنا في هذه الكوفة واجعلها منزل ثبات[2]۔ پھر یکم محرم ۱۷ھ کو شہر کا ماسٹر پلان بنا، شہر کے وسط میں جامع مسجد کی جگہ مقرر ہوئی اور ایک بہتر تیر انداز کا تیر جتنی دور تک جاسکتا ہو، اتنی جگہ ہر چہار جانب چھوڑ کر شہر کی آبادکاری عمل میں آئی، مسجد کے مقابل اسی فاصلہ سے دار الامارۃ اور بیت المال بنا، شاہ راہِ عام

(۱) طبری: ۴/۱۴۱۔ (۲) البدایہ والنہایہ: ۷/۷۵۔

چالیس ہاتھ، دوسری سڑکیں ۲۰ تا ۳۰ ہاتھ کی بنائی گئیں اور گلیوں کے لئے بھی سات ہاتھ کے فاصلے رکھے گئے، مکانات اولاً بانس کی ٹٹیوں کے بنائے گئے، مگر آتش زدگی نے ایک سال بھی گزرنے نہ دیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے خام اینٹوں سے دوبارہ تعمیر عمل میں آئی"[1]۔

اس طرح مدائن سے مجاہدین کا قافلہ کوفہ آیا اور یہیں خیمہ زن ہوا، اس شان وبان کے ساتھ دریائے فرات کے ساحل پر اس شہر کی تعمیر کا مقصد صرف مسلمانوں کی ایک بستی ہی بسانا نہیں تھا، بلکہ یہ گویا مشرق کی مردم خیز اور ذہانت وطباعی سے عطر بیز مملکت میں اسلام کے فکری و علمی اور تمدنی و ثقافتی دار الخلافہ کی تعمیر تھی، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ذہن رسا شروع سے اس جانب متوجہ تھا، اول تو بقول طبری مدائن ہی میں چالیس ہزار صحابہؓ ناموافقت آب و ہوا کا شکار ہوئے تھے، جب مجاہدین کا قافلہ کوفہ آیا ہوگا تو ظاہر ہے کہ ان میں ہزاروں صحابہؓ بھی شریک رہے ہوں گے، پھر اس علاقہ کے گورنر خود حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے، جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، علاوہ اس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاص تعلیم و تربیت کی غرض سے افقہ الامۃ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا، حضرت عمرؓ کی نگاہ میں عبد اللہ بن مسعودؓ کا جو علمی مقام تھا اس کا اندازہ اس فقرہ سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس موقع سے اہل کوفہ کو لکھا کہ ابن مسعودؓ کو بھیج کر میں ایثار سے کام لے رہا ہوں" قد آثرتکم بعبد اللہ بن مسعود علی نفسی"[2] ابن مسعودؓ کے بارے میں خود آپ نے شہادت دی تھی کہ تم سیکھے سکھائے ہو "علیم معلم"[3]۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کو چار اشخاص سے سمجھو اور چار میں سب سے پہلے حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا نام لیا، حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد دار الخلافہ بھی مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا اور خود حضرت علیؓ نے اپنی ذات والاصفات سے اس شہر کو رونق بخشی، حضرت علیؓ کے امت کے سب سے بڑے قاضی ہونے کی شہادت حق تو خود دربار رسالت سے مل چکی تھی، اصابت رائے کا یہ حال تھا کہ حضرت عمرؓ اس بات سے خدا کی پناہ چاہتے تھے کہ کوئی مشکل پیش آئے اور اس کے حل کے لئے حضرت علیؓ موجود نہ ہوں، حضرت سعید بن مسیبؒ کا بیان ہے کہ " کان عمر یتعوذ باللہ من معضلۃ لیس لھا ابو الحسن"[5]۔ صحابہؓ چونکہ

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۷/۵۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۴۔

(۳) اعلام الموقعین: ۱۶/۱۰۔ (۴) حوالۂ سابق۔ (۵) حوالۂ سابق۔

عام طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ برحق تصور فرماتے تھے اور انہیں کو خلافت کے لئے سزاوار جانتے تھے، اس لئے حضرت علیؓ کے ساتھ ساتھ بہت سے صحابہؓ نے بھی کوفہ کا رختِ سفر باندھا، طبقاتِ سعدؒ کی روایت کے مطابق کوفہ میں اقامت اختیار کرنے والے صحابہؓ میں ستر شرکاءِ بدر اور آٹھ سو اصحابِ بیعتِ رضوان تھے۔[1]

اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کوفہ اس عہد میں علم و تفقہ کا مرکز بن گیا تھا، مسروق کہا کرتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ تمام صحابہؓ کے علوم کی نہایت چھ اشخاص تھے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابیؓ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو درداءؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور پھر ان چھ کے علوم دو صحابہ میں جمع ہو گئے تھے، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ۔[2] اس طرح کوفہ گویا ایک علمی مرکز تھا جہاں سے علوم اسلامی کے چشمے پھوٹتے تھے اور تفسیر و حدیث و فقہ سے لے کر کلام و ادب تک تمام علوم و فنون کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔

اس نسل کے بعد جن اکابر تابعین نے حدیث و فقہ کی اس درسگاہ کو زینت بخشی ان کی بھی بڑی تعداد ہے، ابن قیمؒ نے چونتیس حضرات کے اسماء ذکر کئے ہیں[3]۔ تاہم ان میں سب سے ممتاز و نمایاں شخصیت علقمہ نخعیؒ اور اسود نخعیؒ کی تھی، یہ دونوں بزرگ نہ صرف عبد اللہ مسعودؓ کے علم و فکر کے حاملین میں تھے، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی استفادہ کر چکے تھے، پھر ان دونوں حضرات سے بارِ امانت ابراہیم نخعیؒ (م ۹۶ھ) اور طاہر شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) نے اٹھائی، حماد ابن سلیمانؒ (م ۱۲۰ھ) نے نخعی اور شعبی سے کسبِ فیض کیا اور ان کے بعد علم و تفقہ اور فکر و نظر کی امانت و سیادت کا تاج گہربار اور گل صد بہار امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) کے سر کی زینت بنا، علم و فن کے اس سلسلۃ الذہب کی طرف امام ابو حنیفہؒ نے اس وقت اشارہ کیا، جب منصور نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کے علوم کا ماخذ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے اصحاب عمرؓ سے حضرت عمرؓ کا، اصحاب علیؓ سے حضرت علیؓ اور اصحاب ابن مسعودؓ سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے علوم حاصل کئے ہیں: اخذت العلم من اصحاب عمر عنہ و عن

---

(۱) طبقات، ۶/۷۔ (۲) مقدمہ ابن صلاح ۱/۱۲۷۔

(۳) اعلام الموقعین، ۱/۲۵۔

اصحاب علی عنہ و عن اصحاب ابن مسعود عنہ[1]۔

اصحابُ الرائے واصحابُ الحدیث

فقہ حنفی میں حدیث سے اخذ واستنباط کا منہج کیا ہے ؟ اس کو سمجھنے کے لئے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شروع ہی سے کتاب وسنت سے استنباط میں دو مکاتب فکر رہا کئے ہیں، ایک طبقہ وہ تھا جو حدیث کی حفظ وروایت کی طرف زیادہ متوجہ تھا، اور نصوص کے ظاہر پر حکم لگاتا تھا، نیز نصوص پر محض اسناد وروایت کے پہلو سے غور کرتا تھا، دوسرا گروہ وہ تھا جس نے قرآن و حدیث سے احکام کے استنباط پر زیادہ توجہ دی، وہ محض الفاظِ حدیث کے ظاہری مفہوم پر اکتفاء کرنے کے بجائے اس کے گہر معانی ومقاصد میں بھی غواصی کرتا تھا اور روایات کو خارجی قرائن کی روشنی میں بھی پرکھتا تھا، اس کام کے لئے زیادہ ذہانت وذکاوت، وسعتِ نظر، تعمقِ فکر اور احوالِ زمانہ سے آگہی مطلوب تھی، پہلا گروہ "اصحاب الحدیث" کہلایا اور دوسرا گروہ "اصحاب الرائے" اس لئے یہ لقب متقدمین کے نزدیک وجہ تعریف تھا نہ کہ باعثِ مذمت، جیسا کہ آج کل بعض کوتاہ بیں سمجھتے ہیں۔

ائمۂ اربعہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اس لقب کے زیادہ مستحق تھے اور اسی لئے حنفیہ اور مالکیہ کی فقہ میں قربت بھی زیادہ ہے، حالانکہ خود امام مالکؒ کا اپنا مزاج "اصحاب الحدیث" سے قریب تھا، لیکن ان کے استاذ "ربیعہؒ" "اصحاب الرائے" میں سے تھے اور اسی لئے بہ طور تعریف وتکریم "ربیعۃ الرائے" کہلاتے تھے، امام ابو حنیفہؒ کی ذہانت وطباعی کا حال یہ تھا کہ لوگ ان کو "اعقل اهل الزمان" اور "اعلم اهل الزمان" کہتے تھے، اس لئے وہ بھی "اصحاب الرائے" میں شمار کئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ "اصحاب الرائے" اور "اصحاب الحدیث" کے گروہ عہدِ صحابہؓ ہی سے تھے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کا شمار "اصحاب الرائے" میں تھا، اور حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ

---

(۱) الخیرات الاحسان : ۴۳ ۔

اصحاب الحدیث میں تھے، اس کا اندازہ ان مناقشوں سے ہوتا ہے، جو صحابہ کے درمیان پیش آیا کیے ہیں۔

مثلاً حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا کہ آگ میں پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کیا جائے۔

توضئوا مما مسته النار۔ — جس چیز کو آگ نے پکایا ہو اس سے وضو کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا:

ارأیت لو توضأت بماء سخن أکنت تتوضأ منه؟ او رأیت لو ادهن اهلك بدهن فأدهنت به شاربك أکنت تتوضأ منه؟[1] — آپ کی کیا رائے ہے، اگر آپ گرم پانی سے وضو کریں تو پھر آپ وضو کریں گے؟ اگر آپکے اہلِ خانہ نے تیل لگایا اور کچھ تیل آپ کی مونچھ میں لگا دیا، تو آپ اس سے وضو کریں گے؟

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا:

من حمل جنازة فلیتوضاء۔ — جو جنازہ اٹھائے آئے، اسے وضو کرنا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أیلزمنا الوضوء فی حمل عیدان یابسة؟ — کیا خشک لکڑیوں کے اٹھانے سے بھی ہم پر وضو واجب ہوگا؟

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے:

ان ولد الزنا شر الثلاثة۔ — ولد الزنا تین میں سے ایک شر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنا تو فرمایا:

کیف یصح هذا؟ وقد قال اللہ تعالیٰ: — یہ بات کیسے درست ہوگی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

ولا تزر وازرة وزر اخری۔ — ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

پس حضرت ابوہریرہؓ کا طریقِ استنباط اس اندازِ فکر کی نشان دہی کرتا ہے جو "اصحاب الحدیث" کا تھا، جس میں نصوص کے ظاہری الفاظ پر انحصار کی کیفیت تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا طریق "اصحاب الرائے" کے طریقۂ اجتہاد و فکر کی نمائندگی کرتا ہے، جس میں تعمقِ فکر اور غواصی پائی جاتی ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، اور حضرت عبداللہ

---

(۱) اصول السرخسی: ۱/۳۴۰۔

بن مسعود رضی اللہ عنہ کی آراء سے بڑی موافقت پائی جاتی ہے اور اگر ان صحابہ کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے تو شاید دس فیصد مسائل بھی فقہ حنفی کے اس سے باہر نہ جائیں۔ فقہ مالکی میں بھی چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آراء اور فتاویٰ سے بہت استفادہ کیا گیا ہے، اسی لئے اس فقہ میں عام فقہاء حجاز کی طرح ظاہریت نہیں پائی جاتی۔

حدیث کے قبول و رد کے باب میں حنفیہ کا مذاقِ خاص

فقہ حنفی کے طریقۂ استدلال کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں حدیث کو قبول و رد کرنے اور متعارض نصوص میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں محض راویوں کی ثقاہت ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ خارجی قرائن و شواہد کو بھی اس باب میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، جہاں سند حدیث کو اصولِ روایت کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے، وہیں متن حدیث کے قبول و رد کرنے میں تقاضاء درایت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند امور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

قرآن مجید سے موافقت

یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا حرف حرف نص قطعی ہے اور اپنے ثبوت کے اعتبار سے ہر شک و شبہہ سے بالاتر، احادیثِ متواترہ کے سوا کوئی اس درجہ صحت وقوت کے ساتھ ثابت نہیں، اس لئے حنفیہ کے یہاں حدیث کے مقبول اور نامقبول ہونے میں قرآن مجید سے اس کی موافقت کو بڑا دخل ہے، امام سرخسی فرماتے ہیں:

اذا کان الحدیث مخالفا لکتاب اللہ فانہ لا یکون مقبولا ولا حجۃ للعمل بہ عاما کان الآیۃ او خاصا، نصا او ظاہرًا عندنا علی ما بیناً ان تخصیص العام بخبر الواحد لا یجوز ابتداء وکذالک ترک الظاہر

جب حدیث کتاب اللہ کی مخالف ہو تو مقبول نہیں ہوگی اور نہ عمل کے لئے حجت ہوگی، آیت عام ہو یا خاص، نص ہو یا ظاہر؛ کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ خبرِ واحد سے کتاب کی تخصیص ابتداءً جائز نہیں، اسی طرح خبرِ واحد کی بنا پر مجاز پر عمل کرنا اور ظاہر کو چھوڑ دینا ہمارے نزدیک جائز

فیہ والعمل علی نوع من المجاز لا یجوز بخبر .... نہیں، بخلاف امام شافعیؒ کے ....
الواحد عندنا خلافاً للشافعی[1]۔ ....

اسی لئے بعض اوقات ایک حدیث سند کے اعتبار سے قوی ہوتی ہے، لیکن قرآن مجید کو اصل بنا کر اس حدیث میں تاویل کی جاتی ہے اور اس کا ایسا مصداق متعین کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید سے اس کا تعارض نہ رہے، مثلاً حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے آپؐ کا ارشاد مروی ہے کہ مطلقہ بائنہ کے لئے نہ نفقہ ہے نہ سکنیٰ، "لا نفقۃ و سکنیٰ للمبتوتۃ" لیکن یہ حدیث بہ ظاہر سورۂ طلاق کی آیت ۶ سے متعارض ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: "واسکنوھن من حیث سکنتم" اور "ان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن"۔ اس لئے حنفیہ کا نقطۂ نظر ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی حدیث ایک استثنائی واقعہ ہے اور مطلقہ بائنہ ہو یا رجعیہ، دونوں ہی کے لئے نفقۂ عدت واجب ہے۔

اسی طرح بعض ایسی روایتیں جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، اس لئے قبول کر لی جاتی ہیں کہ وہ معناً قرآن سے مطابقت رکھتی ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من جمع بین صلوتین من غیر عذر فقد أتی باباً من أبواب الکبائر[2]۔ — جس نے بلا عذر دو نمازوں کو جمع کیا، وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔

اس روایت کا مدار حنش بن قیس ہیں، جو ضعیف ہیں، لیکن آیت قرآنی: "ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً"۔ سے فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے کہ نمازیں اپنے مقررہ اوقات ہی پر ادا کی جائیں، اس لئے حنفیہ کے یہاں معنیً یہ روایت مقبول ہے۔

متعارض احادیث کی ترجیح میں بھی حنفیہ کے یہاں اس اصول کو خوب برتا گیا ہے کہ جو روایت اپنے معنیٰ اور مصداق کے اعتبار سے قرآن مجید سے موافقت اور قربت رکھتی ہو اسے ترجیح دی جائے کہ احکامِ صلوۃ سے متعلق اکثر مشہور مسائل جن میں حنفیہ اور فقہائے حجاز کے درمیان اختلافِ رائے

---

(۱) اصول السرخسی ۱/۳۶۴۔ (۲) ترمذی ۱/۹۳۔

پایا جاتا ہے، پر غور کیا جائے تو حنفیہ کا نقطۂ نظر اسی اصول پر مبنی نظر آتا ہے، مثلاً "قراءۃ فاتحہ خلف الامام" ہی کا مسئلہ ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحہ الکتاب" کے عموم سے مقتدی کے لئے قرأت کا وجوب ثابت ہوتا ہے، دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ:

انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب امام اللہ اکبر کہے تو اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو خاموش ہو جاؤ۔

یہ دونوں روایتیں بظاہر متعارض ہیں، فقہائے حجاز نے عام طور پر پہلی روایت کو ترجیح دیا ہے اور سری اور بعضوں نے جہری نمازوں میں بھی مقتدی کے لئے قراۃ فاتحہ کو واجب یا کم سے کم مشروع قرار دیا ہے، حنفیہ نے دوسری حدیث کو ترجیح دیا، اس لئے کہ ارشادِ خداوندی "اذا قرء القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا[۱]" سے یہی حدیث مطابقت رکھتی ہے اور پہلی روایت کو منفرد اور امام سے متعلق قرار دیا۔

اسی طرح آمین کے مسئلہ کو لے لیجئے، آمین بالجہر اور آمین بالسر دونوں روایتیں صراحتاً حضرت وائل ابن حجر سے مروی ہیں، شعبہؒ سے سر کی روایت منقول ہے اور سفیان سے جہر کی۔ حنفیہ نے شعبہؒ کی روایت کو ترجیح دیا، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آمین دعا ہے اور قرآن مجید نے دعا کا ادب یہ بتایا ہے کہ دعا کرتے وقت قلب میں فروتنی و عاجزی کی کیفیت ہو اور آواز میں خفاء "ادعوا ربکم تضرعا و خفیۃ۔[۲]"

قرآن پاک سے موافقت کی بنا پر حدیث کا مقبول و نامقبول ہونا، یا متعارض روایات میں اس کی بنا پر ترجیح دینے کے اصول کو حنفیہ نے زیادہ برتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ احناف کا طبع زاد اصول ہے اور وہ اس میں منفرد ہیں، بلکہ اصولی طور پر دوسرے اہلِ علم نے بھی اسے تسلیم کیا ہے چنانچہ علامہ سیوطیؒ کا بیان ہے:

وقال ابو الحسن ابن الحصار فی تقریب

ابو الحسن بن حصار نے تقریب مدارک علی موطا امام مالک

---

(۱) الاعراف، ۲۰۴۔ (۲) الاعراف، ۵۵۔

المدارك على موطا مالك ، قد يعلم الفقيه صحة الحديث اذا لم يكن فی سنده كذاب بموافقة آيه من كتاب الله او بعض اصول الشريعة فيحمله ذالك على قبوله والعمل به[۱]

میں لکھا ہے کہ بعض اوقات فقیہ جس حدیث میں کوئی کذاب راوی نہ ہو، قرآن کی کسی آیت، یا اصولِ شرع میں سے کسی اصول سے موافقت کی وجہ سے اس حدیث کی صحت کا یقین کر لیتا ہے اور یہ چیز اس کو حدیث کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

کتب حدیث میں اس طرح کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً نمازِ حاجت کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ کی جو روایت منقول ہے وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے' امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر ان الفاظ میں نقد کیا ہے:

قال ابو عیسی: هذا حديث غريب وفی اسناده مقال: فائد بن عبد الرحمن يضعف فی الحديث[۲]

امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے، اس کی سند میں کلام ہے، فائد بن عبد الرحمن اس میں ضعیف ہیں۔۔۔

....

لیکن تمام ہی فقہاء نے غالباً ارشادِ ربانی " استعينوا بالصبر والصلوٰة " کی روشنی میں اس حدیث کو تسلیم کیا ہے۔

بلکہ خود عہدِ صحابہؓ میں بھی جو حضرات اصحاب الرائے کہلاتے تھے، باوجودیکہ سند حدیث کی تحقیق کی ان کو کوئی حاجت نہیں تھی، انہوں نے بھی اس اصول کو بعض احادیث کے قبول اور رد کرنے میں معیار بنایا ہے، چنانچہ مطلقہ کے نفقۂ عدت کے سلسلہ میں حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کی مذکورہ روایت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور ارشاد فرمایا:

لا ندع كتاب ربنا وسنة نبينا لقول امراة[۳]

ہم ایک عورت کی بات کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اسی طرح مشہور روایت: "ان الميت ليعذب ببكاء اهله عليه[۴]" پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رد فرمایا اور قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا کہ: " لا تزر وازرة وزر اخرىٰ[۵] " پس

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/۴۸، ط: دار الکتاب العربی، بیروت۔ (۲) ترمذی: ۱/۱۰۹، باب ماجاء فی صلوٰۃ الحاجۃ، ط: دیوبند۔

(۳) سنن بیہقی، ۷/۴۳۷۔ (۴) بخاری شریف، باب ماجاء فی البکاء علی المیت۔ (۵) الانعام ۱۶۴۔

گرچہ حنفیہ نے اپنے اجتہادات میں اس اصول کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے، لیکن درحقیقت اصولی طور پر تمام ہی اہلِ علم کو اس سے اتفاق ہے۔

قواعدِ شریعت سے مطابقت

حنفیہ کے طریقۂ استدلال کے سلسلہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں روایات کے مقبول ونامقبول ہونے میں اس بات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ جو روایت شریعت کے عمومی مزاج ومذاق اور اصول وقواعد سے مطابقت رکھتی ہے، بعض اوقات سند میں ضعف کے باوجود مقبول ہوتی ہے، اور بعض روایتیں گو سند کے اعتبار سے قوی ہوتی ہیں، لیکن چونکہ اپنے مضمون اور متن کے اعتبار سے شریعت کے عام اور مسلّمہ اصول ومبادی کے خلاف ہیں اس لئے ایسی حدیثیں رد کردی جاتی ہیں، چنانچہ قاضی ابوزید دبوسی فرماتے ہیں:

الاصل عند اصحابنا ان خبر الآحاد متی ورد مخالفا لنفس الاصول لم یقبل اصحابنا (۱)

ہمارے اصحاب کے نزدیک اصل یہ ہے کہ اگر خبر واحد اصول ہی کے خلاف ہو تو وہ ہمارے اصحاب کے نزدیک معتبر نہیں۔

حنفیہ کے یہاں بہت سے مسائل ہیں جو بظاہر اسی اصول پر منطبق ہیں، جیسے حیوانات کے فضلہ کا ناپاک ہونا، مس مرأۃ اور مس ذکر کا ناقضِ وضوء نہ ہونا، استنجاء بالاحجار میں تثلیث کا واجب نہ ہونا، اور بیع مصرّاۃ کے مسئلہ میں ظاہرِ حدیث پر عمل کرنے کے بجائے تاویل وتوجیہ کی راہ اختیار کرنا اور اس طرح کے کتنے ہی مسائل ہیں جن میں نمایاں طور پر اس قاعدہ کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

متعارض احادیث کی ترجیح میں بھی حنفیہ نے اس اصول سے فائدہ اٹھایا ہے، جیسے صلوٰۃ کسوف ہی سے متعلق روایتوں کو دیکھئے، جن میں ایک رکعت میں ایک رکوع سے پانچ رکوع تک مروی ہے، جمہور نے قوتِ سند پر نگاہ رکھتے ہوئے اس روایت کو ترجیح دیا جس میں ایک رکعت میں دو رکوع کا تذکرہ ہے، حنفیہ نے ان روایتوں کو ترجیح دیا جس میں ایک رکوع کا اشارہ ملتا ہے کیونکہ یہ نماز کی عمومی کیفیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں۔

---

(۱) تاسیس النظر: ۷۷

حنفیہ کے بعد غالباً مالکیہ کے یہاں اس اصول کو زیادہ برتا گیا ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے اس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

اذجاء خبر الواحد معارضا لقاعدة من قواعد الشرع هل یجوز العمل به؟ قال ابوحنیفة: لا یجوز العمل به وقال الشافعی: یجوز وتردد مالك فی المسئلة، قال والمشهور والذی علیه المعول ان الحدیث ان عضدته قاعدة أخری قال به وان كان وحده ترك[1]

خبرِ واحد قواعدِ شرع میں سے کسی قاعدہ سے معارض ہو تو کیا اس پر عمل کرنا جائز ہوگا؟ امام ابوحنیفہؒ نے کہا کہ جائز نہیں ہوگا، امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہوگا، امام مالکؒ کو اس مسئلہ میں تردد ہے، لیکن قولِ مشہور جس کو قبول حاصل ہے، یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے قاعدہ سے حدیث کی مطابقت ہوتی ہو تو امام مالکؒ اس حدیث کا اعتبار کرتے ہیں ورنہ اس حدیث کو ترک کردیتے ہیں۔

حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں واقعہ ہے کہ اس اصول کی رعایت زیادہ ہے، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ محدثین نے اس کو بالکل ہی ناقابل اعتنا سمجھا ہے، خود امام بخاریؒ کے یہاں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اخبار آحاد کے مقابلہ میں شریعت کے قواعدِ عامہ کو مقدم رکھا ہے، امام ترمذیؒ نے کتنی ہی روایتیں نقل کی ہیں اور اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس پر اہلِ علم کا عمل ہے اور بعض ایسی روایتیں بھی ہیں کہ ان کی توثیق بھی کرتے ہیں اور اس کے بھی معترف ہیں کہ اہلِ علم کے یہاں یہ معمول بہ نہیں ہے۔

اسی لئے علامہ سخاویؒ نے ایک اصولی بات لکھی ہے، کہ:

وعلی كل حال فالتقیید بالاسناد لیس صریحا فی صحة المتن وضعفه بل هو علی الاحتمال[2]

بہرحال سند کی قید کے ساتھ حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا متن کے صحیح یا ضعیف ہونے کی صراحت نہیں ہے، بلکہ اس میں دونوں احتمال ہے۔

پھر آگے لکھا ہے:

وكذا اورد الحاكم فی مستدركه غیر حدیث یحكم علی اسناده بالصحة

حاکم نے مستدرک میں ایک سے زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں کہ جن کی سند کے بارے میں صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے اور متن پر

(۱) مالکؒ: ۲۵۰۔ (۲) فتح المغیث: ۱/۱۰۷۔

وعلى المتن بالوهاء بعلة او شذوذ الى غيرهما من المتقدمين وكذا من المتأخرين كالمزني حيث تكرر منه الحكم بصلاحية الاسناد ونكارة المتن[1]۔

علت یا شذوذ وغیرہ کی وجہ سے متقدمین نے ضعف کا حکم لگایا ہے ،یہی حال متاخرین جیسے امام مزنی وغیرہ کا ہے کہ انہوں نے سند کے اعتبار سے ایک حدیث کو قابلِ قبول اور متن کے اعتبار سے ناقابلِ قبول ہونے کا حکم لگایا ہے۔

صحت حدیث میں تلقی بالقبول کا اثر

قبول حدیث کے سلسلہ میں حنفیہ کے یہاں ایک اہم اصول یہ ہے کہ کسی حدیث کا صحابہؓ وتابعین اور ائمۂ مجتہدین کے درمیان درجۂ قبول حاصل کر لینا بجائے خود اس کے معتبر و مقبول ہونے کی دلیل ہے، اسی کو اہلِ علم نے "تلقی بالقبول" سے تعبیر کیا ہے، تلقی بالقبول کی وجہ سے بعض روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود اہل علم کے یہاں پایۂ قبول حاصل کر لیتی ہیں اور اگر صحیح یا حسن ہیں تو ان کے استناد و اعتبار میں اضافہ ہو جاتا ہے، بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو وہ تواتر کے درجہ میں آجاتی ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے "طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان" والی روایت منقول ہے، امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے :

وان كان واردة من طريق الآحاد فصار في حيز التواتر لان ما تلقاه الناس من اخبار الآحاد بالقبول فهو عندنا في معنى المتواتر لما بيناه[2]۔

یہ روایت اگرچہ خبر واحد کے طریقہ پر مبنی ہے ،لیکن تواتر کے درجہ میں ہے ،کیونکہ جن اخبار آحاد کو لوگوں میں قبول عام حاصل ہو جائے وہ ہمارے نزدیک متواتر ہی کے حکم میں ہے ۔

....

مولانا ظفر احمد عثمانی اس موضوع پر سیر حاصل بحث کے بعد رقم طراز ہیں :

بل الحديث اذا تلقته الامة بالقبول

بلکہ جس حدیث کو امت میں قبولِ عام حاصل ہو جائے وہ

---

(۱) فتح المغيث : ۱/۱۰۷۔

(۲) احكام القرآن للجصاص : ۲/۱۳۰۔

فهو عندنا فی معنی التواتر (۱)
ہمارے نزدیک متواتر ہی کے حکم میں ہے ۔

اسی طرح جیساکہ مذکور ہوا تلقی بالقبول کی وجہ سے ضعیف الاسناد روایتیں بھی صحت کے درجہ میں آجاتی ہیں، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مذکورہ روایت کی بابت علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

ومما تصح الحدیث ایضا هو عمل العلماء علی وفقه (۲)
جن وجوہ سے حدیث صحیح ہو جاتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ علماء کا عمل اس کے موافق ہو ۔

نیز مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی کا بیان ہے :

وکذا اذا تلقت الامة الضعیف بالقبول یعمل به علی الصحیح (۳)
جب امت ضعیف حدیث کو عام طور پر قبول کرلے تو صحیح قول کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا ۔

بعض حضرات کے نزدیک خاص صورتوں میں خبر واحد قیاس کے مقابلہ رد کردی جاتی ہے، لیکن اگر اسے تلقی بالقبول حاصل ہو تو وہ ان کے نزدیک بھی قابلِ عمل ہے، علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

وما خالف القیاس، فان تلقته الامة بالقبول فهو معمول به (۴)
جو حدیث قیاس کے خلاف ہو، اگر امت میں اس حدیث کو قبول عام حاصل ہو جائے تو اس پر عمل کیا جائے گا ۔

حنفیہ کے یہاں اس اصول کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے، بلکہ حنفیہ کے یہاں حدیثِ متواتر اور خبر واحد کے درمیان حدیث کی ایک اور قسم "خبر مشہور" کی اصطلاح پر غور کیا جائے تو غالباً وہ اسی اصول پر مبنی ہے، فخر الاسلام بزدوی نے خبر مشہور کی تعریف اس طرح کی ہے :

المشهور ما کان من الآحاد فی الاصل ثم انتشر فصار ینقله قوم لا یتوهم تواطؤهم علی الکذب وهم القرن الثانی بعد الصحابة
خبر مشہور وہ ہے جو اپنی ابتداء کے اعتبار سے تو خبر واحد ہو لیکن پھر مشہور ہو جائے، یہاں تک کہ ایک ایسی جماعت اس کو ناقل ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ناقابلِ تصور ہو اور یہ صحابہؓ کے بعد

---

(۱) قواعد فی علوم الحدیث / ۶۲ ۔
(۲) فتح القدیر :
(۳) الاجوبة الفاضلة : ۵۱
(۴) اصول السرخسی ۱/۳۴۱ ۔

رضی اللہ تعالےٰ عنہم ومن بعدھم"(۱) | اور تابعین کے بعد کے زمانہ میں قبول عام حاصل کرے۔

گویا خبرِ مشہور وہ ہے جو گو عہدِ صحابہؓ میں اخبارِ آحاد کے قبیل سے ہو، لیکن تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں اسے تلقی کا درجہ حاصل ہوگیا ہو، علامہ نسفیؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ خبرِ مشہور کے ذریعہ کتاب اللہ پر زیادتی کے درست ہونے کی وجوہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لان الامة تلقتہ بالقبول واتفاقھم علی القبول لایکون الا بجامع جمعھم علی ذالک (۲)	اس لئے کہ امت میں اسے قبول عام حاصل ہوگیا ہے اور کسی نص کے قبول کرنے پر امت کا اتفاق یقیناً کسی ایسے سبب سے ہوگا، جس نے پوری امت کو اس پر متفق کردیا ہوگا۔

حالانکہ حنفیہ کے یہاں خبرِ واحد کی وجہ سے کتاب اللہ کے عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید نہیں کی جاسکتی، لیکن متعدد روایتیں ہیں کہ احناف نے ان کے ذریعہ تخصیص و تقیید کی ہے جیسے:

- القاتل لایرث۔
- یقید الاب من ابنہ ولا یقید الابن من ابیہ۔
- لا زکوٰۃ فی مال حتی یحول علیہ الحول۔

اسی لئے کہ یہ اور اس طرح کی اخبارِ آحاد نے تلقی بالقبول کی وجہ سے ایک خصوصی درجہ استناد و اعتبار حاصل کرلیا ہے۔

حنفیہ کے یہاں حدیث کی تحقیق و تنقید میں چونکہ درایت کا استعمال زیادہ ہے، اس لئے انہوں نے اس قاعدہ سے بھی زیادہ مدد لی ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دوسرے فقہاء و محدثین کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

فقہاءِ مالکیہ میں علامہ ابن عبدالبرؒ نے حدیث "ھوالطھور ماءہ" (سمندر کا پانی پاک ہے) پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کن الحدیث عندی صحیح لان	لیکن میرے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، اس لئے کہ اہلِ علم نے

---

(۱) اصول البزدوی ۲/۴، ۶۔

(۲) المنار مع کشف الاسرار ۲/۱۳۔

العلماء تلقوہ بالقبول"(۱) — اسے قبول کیا ہے۔

ابن عبدالبر ہی نے تمہید میں "الدینار اربعة وعشرون قیراطا" (دینار چوبیس قیراط کا ہوتا ہے) پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

واجماع الناس علی معنی عنی عن الاسناد فیہ"(۲)

لوگوں کا کسی بات پر اتفاق کر لینا اس کو سند کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے۔

ابو اسحاق اسفرائنی کا بیان ہے:

تعرف صحة الحدیث اذا اشتھر عند ائمة الحدیث بغیر نکیر منھم"(۳)

جب کوئی حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک بلا نکیر مشہور ہو جائے تو اس سے بھی حدیث کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابراہیم شبرخیتی مالکی نے امام نوویؒ کی "اربعین" کی شرح میں لکھا ہے:

محل کونہ لا یعمل بالضعیف فی الاحکام مالم یکن تلقتہ الناس بالقبول فان کان ذالک تعین وصار حجة یعمل بہ فی الاحکام وغیرھا کما قال الشافعی"(۴)

احکام میں حدیث ضعیف پر اس وقت عمل نہیں کیا جائے گا، جب کہ اس حدیث کو قبولِ عام حاصل نہ ہوا ہو، اگر کسی حدیث کو قبولِ عام حاصل ہو گیا تو اب اس کا صحیح ہونا متعین ہے اور وہ احکام اور دوسرے ابواب حجت اور قابل عمل ہے۔

فقہاء شوافع میں علامہ سخاویؒ نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت سے لکھا ہے، فرماتے ہیں:

وکذا اذا تلقت الامة الضعیف بالقبول یعمل بہ علی الصحیح حتی انہ ینزل منزلة المتواتر فی انہ ینسخ المقطوع بہ ولھذا قال الشافعی رحمة اللہ فی حدیث "لا وصیة لوارث" انہ لا یثبتہ اھل الحدیث ولکن العامة تلقتہ بالقبول وعملوا بہ حتی جعلوہ ناسخا

جب امت کسی حدیث ضعیف کو قبول کر لے تو صحیح قول کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا، بلکہ وہ متواتر کے درجہ میں ہو جائے گی وہ دلیل قطعی کے لئے بھی ناسخ بن سکتی ہے۔ امام شافعیؒ نے یہی بات حدیث "لا وصیة لوارث" کے ذیل میں کہی ہے، حالانکہ اصحابِ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں، لیکن چونکہ عام طور پر اس حدیث کو قبول کیا گیا ہے اور عمل کیا گیا ہے تو محدثین نے اسے آیت وصیت کے لئے

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/۴۷، ط: دار الکتاب العربی، بیروت۔ (۲) حوالۂ سابق۔
(۳) حوالۂ سابق۔ (۴) دیکھئے: التحفة المرضیة: ۲۶۴۔

لآية الوصية له"[1]   ناسخ قرار دیا۔

علامہ سیوطیؒ شرح نظم الدرر میں رقم طراز ہیں:

المقبول ما تلقاه العلماء بالقبول و وإن لم يكن له اسناد صحيح، او اشتهر عند ائمة الحديث بغير نكير عنهم"[2]

حدیث مقبول وہ ہے کہ گو اس کی کوئی صحیح سند نہ ہو، لیکن علماء کے درمیان اسے تلقی بالقبول حاصل ہو، یا ائمہ حدیث کے درمیان بغیر نکیر کے وہ حدیث مشہور ہو۔

علامہ سیوطیؒ نے "التعقبات على الموضوعات" میں لکھا ہے:

وقد صرح غير واحد بان من دليل صحة الحديث قول اهل العلم به وان لم يكن له اسناد يعتمد على مثله"[3]

ایک سے زیادہ لوگوں نے اس کی صراحت کی ہے کہ اہل علم کا کسی حدیث کا قائل ہونا حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، گو اس کی کوئی قابل اعتماد سند نہ ہو۔

حافظ ابن حجرؒ "الافصاح على نكت ابن صلاح" میں لکھتے ہیں:

ومن جملة صفات القبول التي لم يتعرض لها شيخنا الحافظ يعني زين الدين العراقي ان يتفق العلماء على العمل بمدلول حديث فانه يقبل حتى يجب العمل به وقد صرح بذالك جماعة من ائمة الاصول"[4]

حدیث مقبول کی کی جن صفات سے ہمارے شیخ حافظ زین الدین عراقی نے تعرض نہیں کیا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ علماء کسی حدیث کے مضمون پر عمل کرنے میں متفق ہوں تو یہ حدیث مقبول ہوگی اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا، ائمہ اصول میں سے ایک جماعت نے اس کی صراحت کی ہے۔

....

نیز علامہ بزدویؒ کا بیان ہے:

واليه ذهب بعض اصحاب الشافعي فقد ذكر في القواطع خبر الواحد الذي تلقته الامة بالقبول يقطع بصدقه"[5]

یہی رائے بعض شوافع کی ہے، کہ جس خبر واحد کو امت نے قبول کر لیا ہو اس کی صداقت کا یقین کیا جائے گا۔

....

---

(1) فتح المغيث للسخاوی: 1/333۔ (2) دیکھئے: التحفة المرضية۔

(3) دیکھئے: تحقیق الاجوبة الفاضلة للشیخ ابی غدة: /229۔ (4) دیکھئے: الاجوبة الفاضلة: /232۔

(5) کشف الاسرار للبزدوی: 2/674۔

فقہ حنبلی کے معروف ترجمان حافظ ابن قیم "کتاب الروح" میں ایک ضعیف روایت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

فھذا الحدیث وان لم یثبت فاتصال العمل بہ فی سائر الامصار والاعصار من غیر انکار کاف فی العمل بہ[1]۔	یہ حدیث اگرچہ ثابت نہیں لیکن تمام علاقوں اور مختلف زمانوں میں بلا انکار و مسلسل اس پر عمل کرنا اس کے مقبول ہونے کے لئے کافی ہے۔

خود علامہ شوکانی کہتے ہیں :

وھکذا خبر الواحد اذا تلقتہ الامۃ بالقبول فکانوا بین عامل بہ ومتاول[2]۔	اور یہی حکم اس خبر واحد کا ہے جس کو امت میں قبول عام حاصل ہو، بعض لوگ اس پر عمل کرتے ہوں اور بعض لوگ اس کی تاویل کرتے ہوں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ تلقی بالقبول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام لوگ اس حدیث پر عمل ہی کرنے لگیں، بلکہ جو لوگ اس حدیث میں تاویل سے کام لیتے ہوں وہ بھی دراصل ان لوگوں میں داخل ہیں جو حدیث کو قبول کر رہے ہیں، جیسا کہ شوکانی کی عبارت " بین عامل بہ ومتاول" سے ظاہر ہے۔

پس تلقی بالقبول ان اسباب میں سے ہے جو ضعیف حدیث کو درجۂ اعتبار عطا کرتا اور صحیح حدیثوں کی قوت و صحت میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے اور یہ ایک متفق علیہ اصول ہے، لیکن احناف نیز مالکیہ نے اس اصول کو زیادہ برتا ہے، مالکیہ کے نزدیک تعامل اہلِ مدینہ کو جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے وہ دراصل اسی اصول کو برتنے سے عبارت ہے، بلکہ غور کیا جائے تو بخاری و مسلم کو حدیث کی دنیا میں جو درجۂ اعتبار و استناد حاصل ہوا ہے وہ اس لئے نہیں کہ اس کے تمام اسناد ہم درجہ ہیں اور کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں، اہل علم کے یہاں یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ بخاری کے سو سے زیادہ راویوں پر تو تشیع کی تہمت ہے اور ناصبیت کی بھی نیز دوسرے باطل فرقوں کی طرف منسوب راویوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، لیکن یہ امت کی طرف سے قبول عام ہی ہے، جس کی وجہ سے ان کتابوں کی احادیث کو مقبول مانا جاتا ہے، چنانچہ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ شیخین کی روایت سے علم یقینی نظری حاصل

---

(۱) التحفۃ المرضیۃ : ۲۶۶/ - (۲) ارشاد الفحول -

ہوتا ہے اور وجہ یہی ہے کہ "انما تلقتہ الامۃ بالقبول"۔

یہاں اس بات کا ذکر نا مناسب ہوگا کہ گو اس موضوع پر اصول حدیث وفقہ کی کتابوں میں جابجا اشارے کئے گئے ہیں، لیکن محدث حسین بن محسن یمانی (م: ۱۳۲۷) کا رسالہ "التحفۃ المرضیۃ فی بعض المشکلات الحدیثیۃ"۔ اس مسئلہ پر ایک بے نظیر تحریر ہے، جو "المعجم الصغیر للطبرانی" کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، اس رسالہ میں دراصل اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ امام ترمذیؒ بعض روایتوں کو ضعیف قرار دینے کے باوجود لکھا کرتے ہیں، کہ اسی پر اہلِ علم کا عمل ہے "العمل علیٰ ہٰذا الحدیث عند اہل العلم" تو روایت کے ضعیف ہونے کے باوجود اس پر کیونکر عمل کیا جاتا ہے؟ مشہور محدث و محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ نے بھی "الاجوبۃ الفاضلۃ" کے اخیر میں اس موضوع پر اپنی تحقیقات رقم فرمائی ہیں جو بڑی چشم کشا اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

یہ تو چند اہم پہلو تھے، جو حنفیہ کے یہاں احادیث کے رد و قبول میں خاص طور پر ملحوظ ہیں، لیکن حنفیہ نے متن حدیث پر صحت وضعف کا حکم لگانے یا متعارض روایات کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے میں مزید جن قرائن و شواہد سے فائدہ اٹھایا ہے اور اصولِ درایت کو برتنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے چند کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب ہوگا۔

(باقی آیندہ)

رمضان ـــــــ نیکیوں کی فصلِ بہار

مولانا محمد نعیم اختر قاسمی سبیلی

ہر کھیتی کا ایک موسم ہوتا ہے جس کے اندر وہ پروان چڑھتی، پھلتی اور پھولتی ہے، وہ کسان جس نے اپنی کھیتی کو آخری مرحلہ تک پہنچانے کے لیے خون اور پسینہ ایک کیا تھا، جاڑے کی ٹھنڈک اور گرمی کی تپش برداشت کی تھی اور شب و روز کی جدّو جہد صرف کی تھی، جب وہ اپنی مسکراتی اور لہلہاتی کھیتی پر نگاہ ڈالتا ہے تو فرطِ مسرّت سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور اس کے انگ انگ سے خوشی اور شادمانی پھوٹ پڑتی ہے، کیوں کہ اس کی محنت بر آئی اور اس کی کاوشوں کا اسے ثمرہ ملا۔

اسی طرح نیکیاں کمانے کا بھی ایک موسم ہے یعنی ماہِ رمضان جو زبانِ حال سے اعلان کرتا ہے کہ اے نیکیوں اور بھلائیوں کے طلبگارو! خوش ہو جاؤ، نیکیوں کا اجر بڑھ گیا ہے، نفل نیکی کا ثواب فرض نیکی کے برابر، اور ایک فرض نیکی کا ثواب ستّر فرض نیکی کے برابر کر دیا گیا ہے ـــــــ یہ مژدۂ جانفزا سُن کر اہلِ ایمان اس نفع بخش سودے کی جانب لپکتے ہیں اور ایک مہینہ تک اسی تجارت میں مشغول و منہمک رہنے کے لیے کمر کس لیتے ہیں، پھر تو دن میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے، تیز دھوپ ہے، آسمان شعلے برساتا ہے، پیاس سے ہونٹ خشک ہیں، تنہائی کا وقت ہے، کھانا اور پانی بھی موجود ہے، مگر ایک لقمۂ طعام یا ایک قطرۂ آب محض خدا کے خوف سے حلق سے نیچے نہیں

اتار سکتا، وضو اور غسل کے اندر بڑی احتیاط سے کلّی کرتا ہے، مبادا پانی کا کوئی قطرہ حلق کے اندر چلا جائے اور روزہ جاتا رہے۔

آخر بندہ یکایک اتنا متقی کیسے بن گیا؟ اور تقویٰ کے اس اعلیٰ مقام پر کب اور کس طرح فائز ہو گیا؟۔

روزے کا فلسفہ:

حسب فرمانِ الٰہی روزے کا اصل فلسفہ ہی یہ ہے کہ اس سے انسان کے دل میں تقویٰ پیدا ہو، عبادت و ریاضت کا ذوق بیدار ہو جو کہ ساری شریعت کی رُوح اور بنیاد ہے اور جس کے اندر ترقی کرتے کرتے انسان فرشتوں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے، سچ کہا ہے ؎

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

روزہ دراصل انسان کو اس بات کی جانب متوجّہ کرتا ہے کہ اس کا ہر لمحہ حکمِ خداوندی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جب حکم آیا کہ دن میں کھانا پینا ممنوع تو خورد ونوش حرام۔ پھر جب دوسرا حکم آگیا کہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد کھانا پینا شروع کردو تو اب تاخیر گناہ۔

ماہ رمضان کی فضیلت:

روزہ اور ماہ رمضان المبارک اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ وہ دو بڑی نعمتیں ہیں جن کی رفعت وعظمت کا تصوّر انسان کی محدود عقل نہیں کرسکتی، خدا کی جانب سے وہ بابرکت عطیہ ہیں جن کی کماحقہٗ قدر انسانی قدرت سے ماوراء ہے۔ ماہِ رمضان کے لیئے یہ فضیلت ہی کیا کم ہے کہ اسی مبارک مہینہ میں نوعِ انسان کی رُشد وھدایت کی راہ دکھلانے والی اور حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والی

قرآنِ کریم جیسی عظیم الشّان اور مقدّس کتاب نازل فرمائی۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ: ۱۸۵)	رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر، اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ کو صحابۂ کرام رضؓ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :-

"اے لوگو! تمہارے اُوپر ایک عظیم الشان اور بابرکت مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے، اس کے اندر ایک ایسی رات بھی آتی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس مہینہ کے روزے فرض ہیں اور رات میں تراویح نفل ہے، اس مہینہ میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستّر فرض کے برابر کر دیا جاتا ہے، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے، یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے، اس کے اندر مؤمن کے رزق میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، جس نے کسی روزے دار کو افطار کرایا تو وہ اس کے گناہوں کے مٹانے اور آتشِ جہنم سے رستگاری کا ذریعہ بنے گا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی آئے، اور جو کسی روزہ دار کو آسودہ کرے گا، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اسے حوضِ کوثر سے ایسا سیراب کریں گے کہ پھر کبھی اسے پیاس نہ لگے گی، یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ اس ماہ کا ابتدائی حصّہ رحمت، درمیانی حصّہ مغفرت اور آخری حصّہ عذابِ جہنم سے آزادی ہے، جو شخص اس مہینہ میں اپنے غلام اور خادم کے کام میں تخفیف کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا اور اسے عذابِ جہنم سے محفوظ فرمائے گا۔" (مشکوٰۃ ۱/۱۷۳-۱۷۴، بحوالہ بیہقی)

ایک اور موقع پر محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، کوئی کھلا نہیں رہتا اور جنّت کے سارے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، کوئی بند نہیں رہتا۔ اور اللہ کا ایک منادی پکارتا ہے کہ اے نیکی کے طالب! آگے بڑھ اور اے بدی کے طالب! اب تو باز رہ، اور اللہ کی جانب سے بہت سارے گنہگار بندوں کو جہنّم سے رہائی دی جاتی ہے، اور یہ سب رمضان کی ہر رات کو ہوتا ہے (۱)

اس ماہ کی انہیں خصوصیات اور فضائل و برکات کی وجہ سے آنحضرت صلیّ اللہ علیہ وسلم دو ماہ قبل ہی حصولِ رمضان کی دعا مانگا کرتے تھے، چنانچہ جب رجب کا چاند دیکھتے۔ تو یہ دعا فرماتے کہ:

اللّٰھم بارك لنا فی رجب و شعبان وبلّغنا رمضان. (۲)	اے اللہ اس ماہ رجب و شعبان کو ہمارے حق میں بابرکت بنا اور ماہِ رمضان کے حصول کی توفیق عطا فرما۔

آخر میں سیّدی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا ایک مکتوب یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"اگر اس مہینہ میں کسی آدمی کو اعمالِ صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شاملِ حال رہے گی۔ اور اگر یہ مہینہ بے دلی، فکر و تردّد اور انتشار کے ساتھ گذرے تو پورا سال اسی حال میں گذرنے کا اندیشہ ہے۔ (۳)

---

(۱) ابن ماجہ، ص: ۱۱۸۔

(۲) مسندِ احمد: ۲۵۹/۱۔

(۳) مکتوباتِ امام ربانی ص: ۴۵۔

روزہ کی فضیلت

دیگر اعمالِ صالحہ کی بابت قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اخلاص کے مطابق دس سے لے کر سات سو گنے تک دیا جاتا ہے مگر روزہ کو اس عام ضابطہ سے علیحدہ رکھا اور فرشتوں سے فرمادیا کہ اس کا ثواب بنفسِ نفیس میں خود عطا کروں گا، اس جوّاد اور فیاض ذات سے اس کے اجر و ثواب کا جتنا بھی تصوّر کیا جائے کم ہے، کیا بعید کہ نامۂ اعمال میں نیکیوں کی کمی کی وجہ سے جہنم کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے روزے کا اتنا ثواب عطا کر دیں کہ وہ ساری بُرائیوں پر بھاری ہو جائے اور عذابِ جہنم سے نجات پا جائے۔ چنانچہ حدیث شریف میں روزہ کو جہنم سے بچنے کی ڈھال قرار دیا گیا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "ہر اچھے عمل کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھا دیا جاتا ہے، البتہ روزہ صرف میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔" اور ایک روایت میں ہے کہ روزہ ڈھال ہے (۱) یعنی گناہ اور دوزخ سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈھال اسی وقت حفاظت کا سامان بن سکتی ہے جب کہ وہ مضبوط اور صحیح و سالم ہو، روزہ کی حالت میں لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، غیبت چغلی، جھوٹ، بیہودہ اور فحش باتیں اور دیگر معاصی اس ڈھال کو توڑ دیتے ہیں، ارشادِ نبویؐ ہے کہ "جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیئے کہ وہ بے ہودہ اور فحش باتیں نہ بکے اور شور و شغب نہ کرے اور اگر کوئی اس سے منہ لگنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔" (۲) ——— ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ "جو شخص روزہ رکھتے ہوئے باطل کلام اور بیہودہ حرکتیں ترک نہ کرے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" (۳)

---

(۱) ترمذی ۱/۱۵۹۔ (۲) بخاری ۱/۲۵۵۔ کتاب الصوم۔

(۳) حوالۂ سابق۔

"کتنی مسرت اور شادمانی کی گھڑی ہوگی جبکہ میدانِ حشر میں ہر طرف کس مپرسی اور نفسا نفسی کا عالم ہوگا، ایسے آڑے وقت حسب ارشادِ نبویؐ روزہ اور قرآن آگے بڑھیں گے اور خُدا کے حضور بندہ کی سفارش کریں گے، کہ اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پوری کرنے سے روکا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما اور قرآن کہے گا کہ میں نے اسے رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، چنانچہ دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول کی جائے گی (۱)۔

یہیں پر بس نہیں بلکہ جنّت کے "بابُ الرَّیان" سے دُور ہی سے ندا دی جائے گی کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ ان کے داخلہ کا یہ دروازہ ہے، چنانچہ روزہ دار اس سے خوشی خوشی جنّت میں داخل ہو جائیں گے پھر وہ دروازہ بند ہو جائے گا (۲)۔

شبِ قدر:

اسی ماہِ مبارک کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جس میں عبادت کرنے کا اجر ہزار مہینہ عبادت کرنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے، جسے قرآن نے "لَیلۃُ القَدر" سے موسوم کیا ہے، یعنی "عزّت والی رات" جس میں عبادت کرنیوالا خواہ کتنا ہی بحرِ عصیاں میں ڈوبا ہوا ہو، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو کر تقربِ الٰہی اور عند اللہ قدر و منزلت کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ماہِ رمضان ہو یا شعبان، شبِ قدر ہو یا شب برأت، عشرۂ ذی الحجہ ہو یا یومِ جمعہ و عرفہ، بمصداق شعر:

رحمتِ حق بہانہ می جوید
رحمتِ حق بہا نمی جوید

---

(۱) مشکوٰۃ ۱/۱۷۳، بحوالہ بیہقی۔

(۲) بخاری ۱/۲۵۴۔ کتاب الصوم۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے کہ بندہ کسی طرح گناہوں سے پاک ہو جائے، اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ ہو اور دارِ آخرت میں بندہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو، بڑے خسارے اور محرومی کی بات ہوگی کہ ان مبارک ایام میں ردائے رحمت تو آگے بڑھ کر انسان کو اپنے اندر چھپانے کی کوشش کرے اور انسان اس سے بے اعتنائی برتے اور بے توجہی کا مظاہرہ کرے۔

اعتکاف

رمضان کے اخیر عشرہ میں جو جہنم سے رہائی کا زمانہ ہے، اعتکاف کرنا مسنون ہے۔ اس کے لغوی معنی جم کر بیٹھنے کے ہیں۔ گویا بندہ ایک فیاض اور داتا کے آستانہ پر اس عزم کے ساتھ جم کر بیٹھ جاتا ہے کہ اپنا منھ بولا انعام لئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ اس کی یاد کو سینہ میں بسائے رہتا ہے، اس کی حمد کے گیت گاتا ہے، اپنے گناہوں اور قصوروں پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے، رب کریم کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے، اس کی رضا اور قرب کا طلبگار رہتا ہے۔ اس کے شب و روز اسی حالت میں بسر ہوتے ہیں، پھر جب عید کا چاند نظر آجاتا ہے اور خدا کی جانب سے انعامات کا اعلان ہوتا ہے تو تصوّر سے زیادہ انعامات کی بارش دیکھ کر خوشی خوشی وہ اپنے اہل وعیال اور خویش و اقارب کے پاس واپس آجاتا ہے۔

محمد رضوان القاسمی

.... اور اقبالؔ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں

ارباب دین و دانش، اصحاب علم و تحقیق اور اہل شعر و ادب میں جو لوگ علامہ اقبالؔ (۱۹۳۸ء ۔ ۱۸۷۳ء، بحوالہ تذکرۂ ماہ و سال) سے قریب تر رہے ہیں، ان میں ایک اہم نام حکیم احمد شجاع (۱۹۶۵ء ۔ ۱۸۹۵ء) کا بھی ہے، حکیم احمد شجاع نے علمی استفادہ علی گڑھ سے کیا تھا، یہ افسانہ نگار بھی تھے انشاء پرداز بھی اور شاعر بھی، لیکن ان کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اتنی شہرت ملی کہ آج بھی ان کو ان کے ڈراموں ہی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، تاہم ان کے شخصی حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی زندگی میں بہت زیادہ مذہبی تھے، انہوں نے بیس سال تک تفسیر کا مطالعہ کیا، ان کا ارادہ تھا کہ قرآن کی مکمل تفسیر لکھیں۔ ابھی پہلی ہی جلد لکھ سکے تھے کہ انتقال ہوگیا، اس طرح اپنی عمر کی آخری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکے۔

حکیم احمد شجاع بچپن ہی سے اپنے والد کے ہمراہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، یہ آمد و رفت عمر کے ساتھ بڑھتی اور پختہ ہوتی رہی۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کے اشتراک سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لئے جدید اردو نصاب بھی تیار کئے تھے۔ اسی طرح جب حکیم صاحب نے رسالہ "ہزار داستاں" جاری کیا تو علامہ اقبالؔ نے اس کے سرورق کے لئے ایک شعر اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا، جو سالہا سال "ہزار داستاں" کے سرورق پر شائع ہوتا رہا۔ شعر یہ ہے ؎

عِشق نے کر دیا مجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

حکیم صاحب کی علامہ اقبال سے روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ایک روز حکیم صاحب نے علامہ اقبالؔ کو بہت زیادہ فکر مند، مغموم اور بے چین پایا۔ گھبرا کر دریافت کیا، خیریت تو ہے۔ آج آپ خلافِ معمول بہت پریشان ہیں، فرمایا، اس خوف سے مضطرب ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔

یہ ہے حکیم احمد شجاع کا اجمالی تعارف اور علامہ اقبالؔ سے ان کی گہری وابستگی اور والہانہ لگاؤ و تعلق کی نوعیت و کیفیت۔ اب اس کے بعد دوسرے پہلو کی طرف آئیے، جس کا تذکرہ حکیم احمد شجاع نے اپنے حالاتِ زندگی پر مشتمل دلچسپ کتاب "خون بہا" (صفحات ۴۳۸ - ۴۴۱) میں کیا ہے اور اسی پہلو کا بیان فی الوقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے۔

"خون بہا" کے مطالعہ سے واضح ہے کہ حکیم صاحب کو ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کا بہت شوق تھا، چنانچہ انہوں نے ملازمت کے دوران بھوپال اور حیدر آباد کا بھی سفر کیا۔ یہاں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد" پاک پٹن" پہنچے، پاک پٹن میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، یہ لوگ تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ تھے، مکتبوں میں پڑھائی ہوتی تھی، کوئی ماڈرن اور جدید اسکول نہیں تھا، چنانچہ حکیم صاحب نے پاک پٹن میں" فریدیہ اسکول" قائم کیا اور سوچا کہ اسے سر سید احمد خاں کے طریقۂ کار کے مطابق چلائیں گے۔ اس سلسلہ میں انہیں علامہ اقبال کے مشورے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ جب لاہور پہنچے تو ان کی خدمت میں نیاز مندانہ اور مستفیدانہ حاضر ہوئے، پاک پٹن کے مسلمانوں کی زبوں حالی تفصیل سے بیان کی۔ علامہ اقبالؔ نے ان کی باتیں غور سے سنیں، پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے، اس کے بعد جو کچھ فرمایا، اسے وہی فرما سکتے تھے، عقل، تجربہ، فلسفہ، تاریخ اور دین و دانش، سب کا نچوڑ، حاصل اور خلاصہ۔ دل تھام کر دیدۂ تر کے ساتھ پڑھئے:-

"جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو، انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملاّ اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟۔ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر، الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعہ کے سوا، مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

حکیم احمد شجاع کا بیان ہے کہ یہ کہتے وقت اقبال کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، وہ فضا کی وسعتوں میں کچھ دیکھنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں ہمیں نظر نہیں آتا، پھر اسی طرح فضا میں نظریں گاڑے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے میں جو ان کے آنسوؤں کے رکے ہوئے طوفانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، یہ اشعار پڑھنے لگے:۔

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں
غضب ہیں یہ "رہبرانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
مسافرانِ رہِ حرم کو رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں

حکیم احمد شجاع نے یہ قطعہ اسی طرح لکھا ہے، جبکہ "کلیاتِ اقبال" (شائع کردہ مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی) میں یہ قطعہ چار بندوں پر مشتمل اس طرح ہے:

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ "مرشدانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبالؔ کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

حکیم احمد شجاع قطعہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس مردِ کامل کے جذب اور شدّتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اور میں اپنی ذمہ داری کے احساس سے کانپ اٹھا۔ اقبالؔ نے میری یہ کیفیت دیکھی تو فرمانے لگے :۔

"تمہاری فطرت میں ایک جوہر ہے جو ابھی تربیّت کا محتاج ہے، تمہارے جوش کی شراب ابھی ناپختہ ہے، اسے ذرا سی دیر اور یہیں رہنے دو، کچھ دن میرے پاس اگر رہو تو میں تمہیں ان باتوں کو بھلانا سکھا دوں گا، جو تم نے کتابوں میں پڑھی ہیں۔ میں مدّت سے ایک دیوانے کی تلاش میں ہوں، شاید تمہارا جنون میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو جائے"۔

یہ ہیں اقبال، ان کی فکر مندی اور درد مندی، وسعت نظری اور ژرف نگاہی، فراستِ ایمانی اور تجزیہ نگاری، دل کا سوز و گداز اور اخلاص و یقین، پختہ عمری میں پختہ خیالی کی دل آویز تصویر ——— آپ ہی سوچئے، ہندوستان میں دینی مدارس و مکاتیب کی جو اہمیّت و افادیت، نافعیّت اور معنویّت ہے، اس پر روشنی بڑے سے بڑے مضمون اور بڑی سے بڑی کتاب میں اس خوبی اور کمال کے ساتھ ڈالی جا سکتی ہے پھر کیا ہے کہ جو چیز اب "بدیہی" ہے اسے "نظری" بناتے ہوئے بحث و مباحثہ کا نیا دروازہ کھولا جائے۔ طرفہ تماشہ تو یہ کہ بعض ایسے فضلاء اور نوجوان جن کی "حیثیتِ عرفی" کا خمیر

مکتب و مدرسہ ہی سے اٹھا ہے، وہ بھی علامہ اقبالؔ کی "فکرِ بسیط" کا مطالعہ کئے بغیر، ان کے بعض اصلاحی اشعار جو وقتی جذبہ اور کسی غلبۂ حال، (نہ کہ دوامی تاثر) کے تحت کہے ہوئے ہیں، تجزیاتی شعور سے ان کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ان مکتبوں کی "تنقیص" میں بے جا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ ایک ہی مسئلہ میں دو طرح کی رایوں کے وقت شاعر اور مصنف کے منشاؔ و مراد کو پانے کے لئے تحلیل و تجزیہ، ذہنی پسِ منظر، اصلی مزاج و طبیعت اور نفسیاتی کیفیت کا دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا پڑتا ہے، رایوں کی زمانی حیثیت کا خیال کرتے ہوئے "قولِ قدیم" اور "قولِ جدید" کی بھی اصطلاح ایسے موقعہ کے لئے رائج ہے، نیز جو لوگ دینی مکاتب و مدارس اور افراد و اشخاص کے بارے میں پہلے ہی سے "بیمار ذہنیت" کے حامل ہیں، انہیں ایسے آزادانہ اور غیر محتاط تبصرے سے تقویت پہنچتی ہے۔

اس لئے راقم الحروف کے خیال میں امت اور ملت کے بڑے مفاد کی خاطر کسی ایسی چھوٹی بات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہئے جس سے عمومی طور پر دینی اشخاص و افراد اور دینی اداروں سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہو، اسلام میں اصلاحِ حال کے لئے پورا فلسفہ اور نظریہ موجود ہے، اگر کسی دینی ادارہ میں فی الحقیقت کوئی بات ہو بھی تو ذاتی اور شخصی حملے کی بجائے حکمت و موعظت سے کہی ہوئی بات زیادہ مؤثر، مفید اور نفع بخش ہوتی ہے، چہ جائیکہ گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگنے کی کوئی صورت سامنے آئے اور انجام کار اقبالؔ کا یہ مصرعہ صادق آئے کہ ؏

"مسافرانِ رہِ حرم کو، رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں"

عصری تعلیم اور عصری اداروں کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ حقیقت ہے، تاریخی حیثیت سے علی گڑھ، عثمانیہ اور جامعہ ملیہ کا قیام دراصل اسی تسلیم شدہ حقیقت کے عملی مظاہر ہیں، تاہم دیوبند، مظاہر علوم، ندوہ، جامعہ نظامیہ اور دیگر دینی مدارس کی دینی اور ملی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اس سے انکار تو دین سے ناآشنائی اور ملت سے بے ربطی کی علامت ہوگی، جبکہ ان دونوں معاملات میں حال یہ ہونا چاہئے کہ:

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ ∴ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے اور سوسائٹی میں بہت سارے حکیم احمد شجاع جیسے جوان ہیں، جنہیں اقبالؔ جیسے "دانائے روزگار" (جس کی مثال سے کوئی دور اور زمانہ خالی نہیں رہے گا) سے ربط و تعلق کی ضرورت ہے، یہی وہ ربط و تعلق یا دوسرے لفظوں میں بڑے اور بزرگوں کی صحبت و معیّت اور ان سے مشورے کی برکت کا اثر ہوگا جس سے ایسے جوان "خام خیالی" سے "پختہ خیالی" کی سمت سفر کر سکتے ہیں، جذبات کے بہاؤ سے حقائق کے ٹھہراؤ کی طرف آسکتے ہیں، کورس کے لفظی گورکھ دھندوں سے نکل کر معانی کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں، "کرامتِ مکتب" پر نظر رکھتے ہوئے "فیضانِ نظر" کی اہمیّت کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ایسے ہی جوانوں کی جوانی کے جنون سے اقبالؔ حق شناس پُر امید ہیں کہ وہ فطرت کے رموز سے آگاہ ہوگا، اور ہندوستان کے حالات کے تناظر میں دینی مکاتب و مدارس کے تئیں باچشمِ نم، لرزتے ہونٹوں کے ساتھ، دل میں سُرورِ عشق اور چہرے پر یقین کا نور لئے ہوئے، ان کے ہی اس نغمہ کو فضا میں بکھیرتا جائے گا کہ:

ؔ
ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

مولانا رضوان احمد ندوی، رفیق امارت شرعیہ پٹنہ

عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ
حقائق و واقعات کی روشنی میں

قوموں کے مذہب و اخلاق اور معاشرت و تمدن کے قدیم اصول و نظریات عورتوں کی تعلیم و تربیت سے قائم رہ سکتے ہیں، قدرت نے ان کی فطری ساخت اور طبعی رجحانات میں اتنی لچک دی ہے کہ وہ ہر دعوتِ حق کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے، چنانچہ آفتابِ رسالت کے پہلے ہی دن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسلام کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ اپنے خدا کے آگے سر بھی جھکا دیا —— "وصلت خديجة آخر يوم الاثنين"

اسلام کے ابتدائی عہد میں خاندانِ قریش میں سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ وغیرہ تحریر و کتابت سے آشنا تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں شفار بنت عبد اللہ عدویہ نامی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں، جن کی فیضِ صحبت سے ام المومنین حضرت حفصہؓ نے استفادہ بھی کیا، حرمِ نبوت میں دوسری ازواجِ مطہراتؓ میں حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ نوشت و خواند سے اچھی طرح آشنا تھیں، بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو فضل و کمال میں اس مقام پر پہنچی ہوئی تھیں، کہ وحی کی معصوم زبان نے اس کی شہادت دی کہ میری وحی کا آدھا علم میرے سارے صحابہؓ سے حاصل کرو، اور آدھا علم تنہا عائشہؓ سے حاصل کرو، یہی وجہ ہے کہ اکابر صحابہؓ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھتے، حجرے کے سامنے پردہ پڑا رہتا تھا اور پردہ کی اوٹ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود بیٹھ جاتیں اور حدیثیں بیان فرماتیں۔

عہدِ رسالتؐ میں اکابر صحابیاتؓ دین سیکھنے اور فقہی مسائل دریافت کرنے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتیں، مؤدب ہو کر بیٹھ جاتیں، اس وقت پوری مجلس پر

ایک مقدس سکوت طاری رہتا اور پھر آپؐ سے استفسار کرتیں، آپؐ اس کا جواب دیتے، عورتوں کی تعلیم و تربیت کا آپؐ کو اس قدر خیال تھا کہ ان کے لئے ہفتہ میں ایک خاص دن متعین فرمایا تھا، ان میں قبیلہ انصار کی عورتیں بے جھجک سوالات کرتیں، ان کو تفقہ فی الدین سے شرم و حیا مانع نہ ہوتی —— کائناتِ نسوانی پر ان اکابر صحابیات کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے عالمِ نسوانیت کو بتا دیا کہ مسلمان عورتیں پردہ میں رہ کر علمی و دینی اور اصلاح و بھلائی کا کام انجام دے سکتی ہیں۔ صحابیات کی طرح بعد کے دور کی بہت سی عورتوں نے علمی میدان میں امتیاز حاصل کیا ہے، علماء و صلحاء ہر طبقہ میں ان کی یکساں مقبولیت رہی ہے، مصر کی بہت بڑی محدثہ نفسیہ بنت الحسن بن زید ممتاز شخصیت کی حامل خاتون تھیں، اکابر محدثین اور ائمۂ وقت نے ان سے استفادہ کیا، ان کی علمی و دینی حیثیت اتنی ممتاز تھی کہ جب امام شافعیؒ مصر گئے تو انہوں نے اس عظیم محدثہ سے حدیث سنی۔ اسی طرح بغداد کی شہدہ بنت احمد الفرج کے فضل و کمال کا ائمۂ محدثین نے اعتراف کیا، ہرات کے مشہور محدث حضرت ابوذرؒ نے اپنے شاگردوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد بخاری شریف کا درس احمد المروزی کی لڑکی کریم بنت احمد سے لینا۔

علم و فن کے امام اور مذہب حنفی کے جید عالمِ دین حضرت امام جعفر طحاویؒ کی لڑکی حدیث املاء کرتی تھیں، باپ حدیث بیان کرتے تھے اور بیٹی لکھتی جاتی تھیں، جو بعد میں کتابی شکل میں مرتب ہو کر طحاوی شریف کے نام سے مشہور ہوئی۔ علامہ علاء الدین سمرقندیؒ کی بیٹی فاطمہ کی شخصیت علمی کمالات اور دینی خدمات میں اتنی ممتاز تھی کہ محدثین و فقہاء عظمت سے ان کا نام لیتے تھے ان کی نظر فقہ و فتاویٰ پر بہت گہری اور وسیع تھی، باپ اور بیٹی دونوں کے دستخط سے فتویٰ صادر ہوتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت حسین و جمیل اور خوبصورت بھی تھیں، بڑے بڑے علماء و فقہاء نے ان سے نکاح کا پیغام دیا، مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ دیا تھا، اس لئے پیغامِ نکاح قبول نہیں ہوتا تھا، بالآخر یہ شرط مقرر کی گئی کہ تمام فقہاء فن فقہ میں کتابیں تصنیف کریں جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی، میں اس سے نکاح کرلوں گی، اس پر ہزاروں مصنفوں نے کتابیں تصنیف کیں، مگر کسی کی کتاب پسند نہ آئی، صرف علامہ علاء الدین الکاسانی کی کتاب "بدائع الصنائع"

پسند آئی اور ان سے نکاح کیا۔ تاریخ کے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ، تابعین، اور تبع تابعین کے عہد میں محدثات بھی تھیں اور فقیہات بھی، ان کے علمی کمالات اور عمدہ سیرت سے خلقِ عظیم نے استفادہ کیا، بڑے بڑے علماء و صلحاء نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

سیرت نگاروں نے امام احمد بن حنبلؒ کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ تین سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدہ محترمہ نے ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا نظم کیا، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پانچ سال کے تھے کہ باپ نے اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا، اس دُرِّ یتیم کی پرورش اور دینی و اخلاقی تربیت والدہ ماجدہ نے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب عورتیں متبعِ سنت اور آدابِ شریعت کی پابند ہوں گی تو اس کے زیرِ اثر پرورش پانے والی نسلیں بھی دیندار اور صالح ہوں گی۔ آزادیٔ ہند کے مردِ مجاہد مولانا محمد علی جوہرؒ ۱۸۷۸ء میں بجنور میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی یتیمی کا داغ لگ گیا تھا، والدہ محترمہ نے جو اپنے وقت کی بڑی صالحہ اور باخدا خاتون تھیں، اس یتیم بچے کی پرورش اور دینی تربیت کا مردانہ ہمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ اہتمام کیا۔

عورتوں کے کمالات کے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی پاکیزہ زندگی اور سیرت کے نیک اثرات شعوری یا غیر شعوری طور پر بچوں پر مرتب ہوتے ہیں، عورتوں کی اصلاح و تربیت سے نظامِ زندگی کی قدریں بدل جاتی ہیں، کیونکہ عورتیں ملت سازی کا کام کرتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ نے قرآن پاک پڑھ کر ان کی تقدیر بدل دی، عورتیں جتنی مہذب شائستہ اور بلند خیال ہوں گی بچے بھی اتنے ہی باادب و دیندار ہوں گے، آداب و اخلاق مہذب عورتوں کے فیضِ نظر سے حاصل ہوتے ہیں ؎

وہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی ✿ سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

بدقسمتی سے زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہن و دماغ اور طبیعت و مذاق میں بھی تبدیلی آنی شروع ہو گئی ہے، کہیں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ تعلیم عورتوں کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہے، چولہا چکی کا کام کرنے والیوں کو گھر کی چہار دیواری کے اندر بند رہنا چاہیے، تعلیم یافتہ بنا کر ان سے ملازمت نہیں کروانی ہے۔ اس طرح کے بوسیدہ خیالات نے طبقۂ نسواں کو تعلیم سے

محروم کردیا، دوسرا طبقہ عورتوں کی تعلیم و تربیت میں حد اعتدال سے بھی تجاوز کر گیا اور اس نے عورتوں کو مردوں کے شانہ بہ شانہ مخلوط تعلیم کو ضروری قرار دیا، گویا وہ عورتوں کو سرکاری دفتروں اور قہوہ خانوں کی زینت بنانا چاہتے ہیں، دراصل یہ دونوں ہی طبقے افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

اسلام نے عورتوں کے مقام و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لئے بقدر ضرورت دین سے واقفیت، عقائد کی درستگی و پختگی اور معاشرت کی اصلاح کو ضروری قرار دیا، تاکہ وہ شوہر کے حقوق اور اولاد کی پرورش بہتر طریقے سے کر سکیں اور اس کے نتیجے میں صالح اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آسکے۔ مگر افسوس ہے کہ لڑکوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لئے بڑے بڑے تحقیقاتی ادارے، علمی مراکز اور یونیورسٹیاں قائم کی جارہی ہیں، مگر عورتوں کی گھریلو تعلیم، امور خانہ داری، سلائی و کشیدہ کاری اور بنیادی تعلیم کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی جارہی ہے، ان کی جہالت اور علم دین سے ناواقفیت کی بنا پر بچے غیر مہذب اور بے دین ہوتے جارہے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

محمد رضوان القاسمی

اُردو ——— مولانا ابوالکلام آزاد کی دکھائی ہوئی راہ

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد ∴	ہر دَور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

کائنات کے فطری نظام میں سورج کی کرنیں بھی ہیں اور پانی کا بہاؤ بھی، سورج کی کرنیں جب دَروازہ اور کھڑکیاں بند دیکھتی ہیں تو وہیں ٹھہر جاتی ہیں، اور ان کے کھلنے کا انتظار کرتی ہیں، دروازہ وا ہوا، کھڑکیوں کے پٹ کھلے تو یہ کرنیں اندر جاتی ہیں، اس کے برعکس معاملہ پانی کا ہے، پانی کی طبیعت میں بہاؤ ہے نہ کہ ٹھہراؤ، جب کبھی بھی وہ اپنا راستہ مسدود پاتا ہے وہاں رُکتا نہیں، فوراً کترا کر رخ بدل دیتا ہے اور دوسری راہ اختیار کرلیتا ہے، گویا سورج کی کرنوں کی راہ میں جب کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو "کشمکش" سے اپنے لئے آگے بڑھنے کی کوئی نئی راہ نہ تراشتی ہیں نہ تلاش کرتی ہیں، بس سَاکت و صامت ٹھہر کر "جمود" کی کیفیت سے دوچار رہتی ہیں، پانی "جمود" سے ناآشنا ہے، بس وہ ہر حالت، ہر صورت میں بہنا چاہتا ہے "حرکت میں برکت" کے فلسفہ کا رازداں ہے۔

نظامِ فطرت کی اس طرح کی بہت ساری مثالوں میں ہم نے صرف سورج کی کرنوں اور پانی کے بہاؤ کی مثالیں پیش کی ہیں، اس لئے کہ یہ مثالیں خدا کی وسیع و عریض کائنات میں مختلف انداز سے پھیلی ہوئی ہیں اور خدا نے جنہیں دلِ حسّاس اور چشمِ بینا عطا فرمایا ہے، ان مثالوں پر شب و روز غور و فکر کرتے ہیں، ان پھیلی ہوئی مثالوں کو تھوڑی دیر کے لئے قدرت کے عظیم شاہکار "انسان" پر مرکوز کیجئے تو

یہاں بھی آپ کو معلوم ہو گا کہ بعض انسان ایسے ہیں جو راستہ چلتے ہوئے اپنے سامنے کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو اسے دور کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں پاتے ہیں، یا تو پیچھے واپس ہو کر "گلشن میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کے خول میں بند ہو جاتے ہیں یا جائے رکاوٹ پر حسرت و یاس کی تصویر بنے نگاہِ عبرت کے لئے "تماشہ" بن جاتے ہیں، مگر وہ لوگ جو کشمکش حیات کے خوگر ہیں، تلاطم سے زور آزمائی میں "لطفِ زندگی" پاتے ہیں، عافیت ساحل میں نہیں بلکہ موجِ طوفان کے حریف بننے میں محسوس کرتے ہیں، عرش و فرش کی آواز پر دھیان دیئے بغیر حد پرواز سے بھی آگے نکل جانے کی جرأت رکھتے ہیں، ان کے کانوں میں کبھی آبشاروں کی یہ صدائے مسلسل آتی ہے

ع چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

بسا اوقات "ہاتف غیبی" یہ آواز دیتا ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں ؛ تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

ایسا شخص "سرِ زندگانی" پر یوں بھی نظر رکھتا ہے ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے ؛ نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ایسے شخص کے سامنے "بندگی" اور "آزادی" کی یہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب ؛ اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

یہ نغمہ بھی اس کی زباں پر ہوتا ہے ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو، کوہ و بیاباں سے ؛ گلستاں راہ میں آئے، تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ایسا باحوصلہ، باہمت، باعزم اور "ہستی کردار" کا حامل انسان پانی کی صفتِ بہاؤ کے ساتھ "مہِ نو" کی اس خصوصیت پر بھی خصوصی نگاہ رکھتا ہے اور اس سے اپنے لئے سبق حاصل کرتا ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا ہے مہِ نو ؛ کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

سورج کی کرنوں اور پانی کے بہاؤ کی تمثیلات اور اس ذیل میں پیش کی جانے والی شعری توضیحات سے بتانا مقصود یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء — ۱۹۵۸ء)

نے کو خالق جو ذہن عطا فرمایا تھا وہ "جمودی" یا "انجمادی" نہیں بلکہ "عملی" اور "حرکیاتی" تھا، وہ ٹھہر جانے، بیٹھ جانے، انتظار کرنے کے خوگر نہیں تھے، چلتے رہنے، ایک راستہ بند ہونے کی صورت میں دوسرا راستہ تلاش کرنے، انتظار کی بجائے نئے اقدام کی جستجو میں سرگرداں رہنے والے تھے، جب کسی شخصیت میں یہ "جوہر" موجود ہوتا ہے تو وہ اختراعی اور ایجادی صلاحیتوں کی حامل بن جاتی ہے۔ اتباع اور تقلید سے زیادہ اجتہاد و تحقیق، اس کے مزاج کا حصّہ بن جاتا ہے، غیب سے مضامین آنے لگتے ہیں، افکار نو کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں، بات میں بات پیدا کرنے کا اسے ہُنر آجاتا ہے، جدّت اور نُدرت اپنی عشوہ طرازیاں دکھلاتی رہتی ہیں، وہ کسی ایک دائرے میں محدود نہیں رہتا، سمندر کی طرح بے کراں ہو جاتا ہے، بلاشبہ مولانا آزادؒ کا شمار ایسی ہی عظیم تاریخی شخصیتوں میں ہوتا ہے، بقول مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی:-

"وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے، محرم اسرارِ دین تھے، مفسّرِ قرآن تھے، محدّث تھے، فقیہ تھے، فلسفی تھے، مؤرّخ تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، انشا پرداز تھے، اخبار نویس تھے، سیاسی مدبّر تھے، قومی لیڈر تھے، مجاہدِ حرّیت تھے۔ ع "ہے رنگ لالہ و گلِ نسرین جُدا جُدا"

مولانا آزادؒ کی انہیں ہمہ جہتی صلاحیتوں اور اختراعی اور ایجادی قوتوں نے انہیں جدید راہوں پر دوڑنا سکھایا تھا، ہر لحظہ ان کے سامنے نیا طور ہوتا تھا اور نئی برقِ تجلّی، ان کا مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا، ان کا جذبۂ تسلسلِ سفر اندر سے آواز لگاتا ہے

وہ مسافر ہوں، جو ہو ختمِ سفر سے بے نیاز ٭ میری ہر منزل نشانِ راہ ہے منزل نہیں

شاید اس معاملہ میں وہ شاہین کے یا شاہین ان کا ہم دم و ہم ساز ہو ے

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ٭ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

آدمی کی آبادی میں ایسے ہی لوگ "لاقنوطی" اور "رجائی" بن جاتے ہیں، یاس اور مایوسی اپنے اندر ہمت نہیں پاتی کہ ان کا سامنا کرے، اس اعتبار سے مولانا آزادؒ ماضی قریب کی اونچی شخصیتوں میں "مینارۂ نور" ہیں، کوئی بھی معاملہ ہو،

وہ "چراغِ رہ گذر" بنے رہے، اس سلسلہ میں مولانا ماہر القادری کی یہ بات ان کے عمیق مطالعے، گہرے تجزیے اور "آزاد شناسی"، کا مظہر ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر انسان کی قلبی کیفیات کی تقسیم کی جائے تو وہ دو اجزاء پر تقسیم ہو جائیں گی، اور یہ اجزاء "قنوطیت" اور "رجائیت"، ہیں تمام دنیا کے مختلف النوع اور متباین الجنس انسانوں کے حالات پر غور کرو تو ان کو یاس و رجا کی کش مکش میں مبتلا پاؤ گے، اسی اعتبار سے بعض انشاء پردازوں نے "قنوطیت"، کو اور بعض نے "رجائیت"، کو اپنا موضوع قرار دیا، لیکن یاس انگیز مضامین سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے مگر خیالات کی بلندی، عزم کے استحکام اور بلند حوصلگی میں ان سے کوئی مدد نہیں لی جاسکتی، بلکہ اس کے برخلاف دل اضمحلال کی طرف مائل ہوتا ہے، اور خیالات میں پستی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابو الکلام ایک سپاہی مسلمان ہیں، جن کے دامنِ امید و رجاء کو یاس نے کبھی نہیں چھوا، یاس انگیز مضامین کو وہ ہاتھ تک نہیں لگاتے، وہ رجائی ہیں اور دوسروں کو بھی رجائیت کی دعوت دیتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غم انگیز موضوع کو وہ کبھی نہیں چھیڑتے، ان کے قلم نے ترکی کے شہیدوں کی لاشوں پر ماتم بھی کیا ہے، ان کی آنکھوں سے کانپور کے خونی ہنگامہ پر خون کے آنسو بھی ٹپکے ہیں، طرابلس الغرب کے مسلم یتیموں اور بیواؤں کی چیخوں پر بھی انہوں نے لبیک کہی ہے مگر اس خونی ماحول اور غم انگیز فضا میں ان کی ایک سانس کو بھی قنوط کا کوئی جھونکا جنبش میں نہیں لاسکا، وہ تو ہر خونچکاں کفن اور ہر مجروح سینہ کی زبان سے نصرت و کامرانی کی بشارت سناتے ہیں تاکہ قوم میں حرکت پیدا ہو، اردو زبان میں ابو الکلام اس طرز کے موجد ہیں، وہ رلاتے نہیں ہنساتے ہیں، وہ بے پناہ طریقہ سے تڑپاتے ہیں مگر ہر تڑپ کو وہ عملی اضطراب کی صورت میں

دیکھنا چاہتے ہیں، شاید اسی اسلوب نگارش سے متاثر ہو کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا تھا کہ "ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے میں نے لیڈری سیکھی ہے"

(ابوالکلام آزاد، ادبی و شخصی مطالعہ، صفحہ ۶۱۱ — ۶۱۰)

مولانا آزاد کے اوصاف و کمالات میں ایجادی، اختراعی، اقدامی اور رجائی واس کا تذکرہ تفصیلی طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ "اردو" سے متعلق اس میں پیغامِ موت بھی ہے اور تحفۂ زندگی بھی، پستی بھی ہے اور بلندی بھی، شکست بھی ہے اور فتح بھی۔ اردو کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے اپنے قول و عمل، فکر و نظر اور پختہ عزم و ارادہ سے جو راہ دکھائی ہے، جس پر ایک پورا کتب خانہ موجود ہے، اس سے اگر فائدہ اٹھایا گیا تو زندگی ہے، بلندی ہے، فتح ہے، اس راہ سے روگردانی کی گئی تو موت ہے، پستی ہے، شکست ہے۔

اس موقع پر یہ پہلو اور بھی پرکشش اور قابلِ توجہ بن جاتا ہے، جب کہ مولانا آزاد کا یہ خاندانی پس منظر نگاہوں کے سامنے ہو کہ وہ مکہ مکرمہ کے عربی ماحول میں پیدا ہوئے اور زندگی کے ابتدائی دس برس وہیں گزرے اور پھر اردو میں شخصی دلچسپی اور ذاتی محنت سے شاعری سے انشاء پردازی تک اور صحافت سے خطابت تک وہ کمال پیدا کیا کہ اردو کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی، ان کے معاصرین اور بعد کے ناقدین (خواہ حلیف ہوں یا حریف) سب کے قلم نے ان کے "ادبِ اردو" کی پیشانی کو والہانہ عقیدت و احترام اور گہری عظمت و محبت کے ساتھ بوسہ لیا ہے، اس سلسلہ میں کس کس کا تذکرہ کیا جائے، بس نمونہ کے لئے دو ہی مثالیں لیجئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا، ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی ہے، ان کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمتِ تخلیق کی، زبان کے باب میں کیا ملکہ

لے کر آئے تھے، لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا، چند مہینے ہی تو شاید رہے تھے، لیکن زبان لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کرلیا کہ جیسے سدا کے لکھنوی ہیں۔" (اُردو کا ادیبِ اعظم، صفحہ ۲۵)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

"جدید اردو نثر، عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا، عرب کے سوز دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت، دونوں کو اردو میں سمو لینا اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں ہے، مولانا آزادؒ کی نثر سے یہ کام ختم ہوگیا، اور اقبالؔ کی نظم سے۔ اَب اردو نثر کی ترقی کے لئے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی سے لئے جا سکتے ہیں، مگر اچھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے، ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا، اس وجہ سے ابوالکلام آزادؔ کے جوشِ قدح سے بزمِ ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔"

(ابوالکلام آزادؔ، ادبی و شخصی مطالعہ، صفحہ ۲۰۵)

مولانا آزادؔ نے اردو صحافت اور اخبار نویسی کو اپنی جودتِ طبع اور نیرنگِ خیالی سے جو نیا رنگ و روپ، نیا لب و لہجہ، نیا انداز اور نیا آہنگ دیا، اس پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے یہ تبصرہ خوب کیا ہے:۔

"۱۹۱۲ء میں الہلال افقِ کلکتہ سے طلوع ہوا، اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی، صورت و سیرت، مغز و قالب، سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار، چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ، رنگین سرِورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا "احمد المکنیٰ بابی الکلام الدھلوی"، یہ المکنیٰ کے صحیح تلفظ اور معنی کے لئے صراح و قاموس کی ورق گردانی

کرنی پڑی۔ اور "ایڈیٹر" کہاں اس کی جگہ "مدیر مسئول، محررِ خصوصی اور رئیس قلم تحریر"، "جریدہ" کی جگہ "مجلہ" "ولایتی ڈاک کی جگہ" "برید فرنگ" "حیرت انگیز" کی جگہ "محیر العقول" قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتے اس "ادبی و علمی ٹکسال" سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔" (اردو کا ادیب اعظم، صفحہ ۱۵)

یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ ذہین اور نابغۂ روزگار ہوتے ہیں، ان کے بعض افکار و نظریات اور خیالات و تصورات سے دیگر اہلِ فکر و نظر کے اختلافات، زمانہ کی روش میں داخل ہے، مولانا آزادؒ کی اونچی اور بلند و بالا شخصیت کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، مزاجی، فکری، علمی، تحقیقی، لفظی، ادبی اور سیاسی، ان میں سے ہر ایک پہلو سے کسی نہ کسی کو ان سے اختلاف ہو سکتا ہے، یہ اختلاف تو فطری ہے، لیکن اس اختلاف نے نہ تو ان کے فکری قد کو چھوٹا کیا اور نہ ہی ان کی "حیثیتِ عرفی" میں کوئی فرق آنے دیا، وہ اپنے سماج میں بڑے تھے، بڑے رہے اور بڑے ہیں، اردو کے سلسلہ میں جو انہوں نے مختلف زمانہ میں مختلف انداز سے نئی اور نرالی راہ دکھائی ہیں، اس میں بھی ان کی بڑائی اور بلند نگاہی صاف نظر آرہی ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کہا، لکھا اور بتایا، اس کی حیثیت "چراغ راہ" اور "نشانِ منزل" کی ہے، جس کا سرسری اندازہ تو آپ کو اوپر کی سطروں سے ہوا ہوگا، مگر میں اب یہ چاہتا ہوں کہ اردو کے بارے میں مولانا آزاد کے جو افکار و خیالات ہیں، ان کو پھیلا کر بیان کرنے کی بجائے نہایت اختصار کے ساتھ سلسلہ وار بیان کئے جائیں۔ اس بیان کی حیثیت بھی کسی مضمون کے عنوان ہی کی ہوگی، جسے اصحابِ فکر و دانش وسعت دے کر دریا کا ہم پلہ بنا سکتے ہیں اور سمیٹنا چاہیں تو "دریا بکوزہ" کا مصداق بھی بنا سکتے ہیں۔

زیر نظر موضوع سے متعلق مولانا آزاد کی باتیں تو بہت سی ہیں مگر میرے خیال

میں یہ باتیں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں، ایک کتاب جس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، وہ ہے " اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصّہ ۔ ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ "۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ہیں، ڈاکٹر شاہ جہاں پوری کے بارے میں خلیق انجم نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

" وہ خود عالم، ادیب اور نقاد ہیں، خدا نے انہیں ان تمام صلاحیتوں سے نوازا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں، اگر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مداح اور معتقد ادیبوں اور نقادوں کی فہرست مرتب کروں تو ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا نام دو تین ناموں میں ہوگا "

(اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ، صفحہ : ۱۶، دہلی ایڈیشن)

یہ کتاب سب سے پہلے ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی سے ۱۹۸۸ء میں (۱۴۴) صفحات پر شائع ہوئی۔ بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے اسی سال جناب خلیق انجم کے وقیع و بلیغ اور بسیط و عریض " پیش لفظ " کے ساتھ (۱۱۲) صفحات پر شائع کیا، اردو زبان کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو خدمات رہی ہیں، ان کے افکار کی جو ایک دنیا ہے، علمی افادات کا جو وسیع تر دائرہ ہے، ان سب کو یکجا سمجھنے اور معلوم کرنے میں یہ کتاب " سنگ میل " کا درجہ رکھتی ہے اور یہ سطریں لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں یہ خواہش سینہ میں مچل رہی ہے کہ کاش مولانا آزاد کے نام پر قائم ہونے والی نیشنل اُردو یونیورسٹی " نیک فال " یا گائڈ بک " کے طور پر اس کتاب کی بڑی تعداد میں شایانِ شان اشاعت سے اپنے اشاعتی اور تعلیمی سفر کا آغاز کرتی تو اس سے یونیورسٹی کے خاکوں اور منصوبوں میں جہاں رنگ بھرنے میں مدد ملتی " رہنمایانہ خطوط " متعیّن ہوتے، اس کے ساتھ یہ کتاب مولانا آزاد کی خدمتِ اردو کی " عظیم یادگار " بنے رہنے کے علاوہ ان لوگوں کے لئے " انمول تحفہ " بھی بنتی جو اردو کی نسبت اور محبت میں اردو یونیورسٹی کے نئے چمن میں سیر کے لئے آتے جاتے ہیں، آزاد سے متعلق یہ کتاب ہاتھ میں آتے ہی شجیع اپنے اس شعر کے ساتھ یاد آتے :

۵ شیخؔ آج سیرِ چمن کو گئے تھے بہت ان کے نقشِ قدم یاد آئے

مولانا آزادؔ نے اردو کے سلسلہ میں جو راہیں دکھائی ہیں، ان کا اندازہ زیرِ تذکرہ کتاب (اردو کی ترقی میں، مولانا آزاد کا حصہ) کے درج ذیل عنوانات سے ہو سکے گا۔

(۱) دعوتی اسلوب (۲) علمی اسلوب، (۳) ادبی اسلوب (۴) بنیادی اسلوب، (۵) خدمتِ زبان۔ (۶) لغات ۔ زبان کی علمی وفنی مباحث پر ایک نظر، (۷) لسان الصدق اور اس کا دائرۂ بحث (۸) ترقی اُردو (۹) تنقید (۱۰) علمی مذاق کی اشاعت، (۱۱) دیسی اور ولایتی الفاظ (۱۲) ترقی اردو اور تراجم علوم و فنون (۱۳) اصطلاحات سازی (۱۴) طریقِ طباعت (۱۵) اردو رسم الخط (۱۶) املا اور علاماتِ تحریر۔ (۱۷) مستی و تحریک کی بحث (۱۸) انجمن ترقی اردو اور دیگر ادارے (۱۹) مولانا آزاد کی ادبی وفنی عظمت کی بنیاد۔

ان عنوانات کے تحت ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مولانا آزادؒ کے نقطہ ہائے نظر کو جس خوبی، کمال اور استدلال سے اجاگر کیا ہے، وہ ہر محبِّ اُردو کے لئے زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہر دور میں "پیغام" ہے۔ اس پیغام کے بعد صرف ایک ہی "کام" باقی رہ جاتا ہے، اس کام کا انحصار نہ تو اردو کو فلاں فلاں ریاست میں سرکاری درجہ دینے کے لئے لاکھوں آدمیوں کے دستخط کے حُصول پر ہے، نہ ہی "گجرال کمیٹی" پر، جس کے گجروں کو کمہلائے، مُرجھائے، باسی اور بوسیدہ ہوئے مدّت بیت چکی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنے وطن ہندوستان میں رہتے ہوئے اردو کے لئے سرکاری طور پر جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، اس سے غفلت برتیں اور جی چُرائیں، حوصلہ و ہمّت اور جرأت و قوت سے کام نہ لیں، اصل میں اس "خارجی کوشش" کے ساتھ مولانا آزاد کا داخلی حیثیت سے جو پیغام اور بتایا ہوا کام ہے، وہ یہ ہے کہ:

"ہمارے نوجوان کئی عالمی زبانوں میں عبور حاصل کرتے ہیں، لیکن اپنی ملکی زبان "اُردو" سے غفلت برتتے ہیں، حالانکہ مہذّب دراصل وہی شخص ہے جو اپنے قومی اور مذہبی لٹریچر سے واقف ہو، جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں

کو اپنی ملکی اور قومی زبان کی تحصیل کی بھی سعی کرنی چاہیئے "۔

(اُردو کی ترقی میں مولانا ابو الکلام آزاد کا حصہ، صفحہ ۷۱-۷۰۔ پاکستانی ایڈیشن)

ہندوستان میں خواہ کوئی بھی سیاسی جماعت برسر اقتدار ہو، مجاہد آزادی اور قومی قائد مولانا آزاد نے سیاسی سطح پر اردو کو ترقی اور استحکام دینے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیئے جو بنیادی اور اصولی بات ارشاد فرمائی تھی، وہ آج بھی ہر محبِّ وطن اور ہر ہمدرد اردو کے لیئے "مشعلِ راہ" ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ:

" انجمن ترقی اردو (دہلی) نے ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں اردو کانفرنس منعقد کی، اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا، اس کانفرنس میں زندگی کی آخری عوامی تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا: "آپ اردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندرلال) نے کہا، یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو ... یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اس اسپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے، ملک آزاد ہوا، وقت آیا، دستور بنا، اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کرلیا گیا، جس کے نتیجے میں اردو کی حیثیّت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا اور اردو کی بات ایک رقیب کی حیثیّت سے کم ہوگئی، اب ہر ہندوستانی کا، جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اسے مانے، وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا ... ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی، اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی جو جگہ ہے، وہ اسے ملنی چاہیئے ..... مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لیئے بلائی گئی ہے، اس میں اسے کامیابی ہوگی۔ اور جب کہ وزیر اعظم (پنڈت نہرو) نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی "۔ (آزاد کی تقریریں، مرتبہ انور عارف دہلی، ۱۹۶۱ء - صفحہ ۲۹۲)

بہرحال اُردو والوں کو اردو کے سلسلہ میں پُر امید رہنا چاہیئے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت پہلے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اردو کی ترویج و ترقی اور استحکام و استقلال کے لئے جو راہیں دکھائی تھیں، کتابت، طباعت، علمی و تحقیقی مواد، لفظوں کے بہتر اور معیاری انتخاب، صحیح املا اور صحیح ترجمہ کا اہتمام، قارئینِ اردو کی ذہنی اور فکری سطح کی بلندی، ہیجانی اور انتشاری ادب سے گریز، غیر ضروری اور بعض مضحکہ خیز جدیدیت سے اجتناب، اردو کی ہر کتاب اور ہر جریدہ و اخبار کو ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے بامِ عروج پر پہونچانا، اردو صحافیوں، شاعروں اور قلم کاروں، خطّاطوں، کاتبوں، ناشروں کی ہمہ جہتی حیثیتوں سے حوصلہ افزائی کے جو خاکے، ضابطے اور منصوبے، آزاد کے یہاں ملتے ہیں، انہیں پوری قوت اور عزم و ارادہ کی پختگی کے ساتھ روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے، جب تک زندگی ہے اور زندگی کے مسائل ہیں "کشمکش،، ساتھ ساتھ ہے، چراغ کو بجھانے کے لئے ہوائیں چلتی رہیں گی، امید کی کشتی کو ڈبونے کے لئے خوف کا طوفان اٹھتا رہے گا مگر "رازِ حیات،، کو پانے والے آزاد ہر اُردو کے جیالے، متوالے اور دیوانے سے مخاطب ہیں:۔

"یہ سچ ہے کہ ہَوا چراغ کی لَو کو بُجھا دیتی ہے، مگر کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ انگیٹھی کے شعلوں کو بھڑکا بھی دیتی ہے"۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں:۔

"سچّائی کے شعلے، مخالفت کے طوفان سے اور زیادہ بھڑکتے ہیں اور یہ معجزہ صرف صداقت کے درخت ہی میں ہے کہ جس قدر اسے چھانٹا جائے، اتنا ہی اور زیادہ نشوونما پاتا ہے"۔

وہ اعلان کرتے ہیں:۔

"دُنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے، اور اعمال کے لئے پہلی چیز اُمید ہے"۔

آئیے! ایسے "آزاد،، کو جس نے آزادی کی جنگ میں قائدانہ کردار ادا کیا

اور آزادی کے بعد بجا طور پر اپنی عظیم شخصیّت کے پسِ منظر میں پہلے "وزیرِ تعلیم" بنائے گئے، ان کی تمامتر صلاحیتوں، قابلیتوں، کارناموں اور اُردو کے محسنِ اعظم بلکہ "شہیدِ جستجو" ہونے کی حیثیّت کو پیشِ نظر رکھ کر اس شعر کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کریں کہ ؎

بھُلا سکیں گے نہ اہلِ زمانہ صدیوں تک
تیری وفا کے، تیرے فکر و فن کے افسانے

اور یہ بھی کہ ؎

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

مناجات

از قلم: شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

سب مراتب میں تری ذاتِ مقدس سے ورے
کس زباں سے کہوں ہے مرتبہ اعلیٰ تیرا
نورِ خورشید چمکتا ہے ہر اک ذرّہ میں
چشمِ بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا
بیمِ دوزخ ہے اسے اور نہ شوقِ جنّت
جس کو مطلوب ہے اِک دَرد کا ذرّہ تیرا
تیرے دیوانوں کو کیا قیدِ علائق سے گزند
دونوں عالم سے بھی آزاد ہے بَڑدا تیرا
دل صد پارہ و ہر پارہ میں ہو داغِ جنوں
نام کندہ ہو ہر اک داغ پہ مولا تیرا
نفس و ابلیس کے پھندے میں پھنسا ہوں لیکن
دِل سے اقرار یہی ہے کہ ہوں بندہ تیرا
ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانیں کہ کیا فضل ہے ربّا تیرا

ط: بردہ: غلام قیدی

سلام

بحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نتیجۂ فکر: مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ

نبی اکرم شفیعِ اعظم دُکھے دِلوں کا سلام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو

شکستہ کشتی ہے تیز دھارا نظر سے رُوپوش ہے کنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام لے لو

قدم قدم پہ ہے خوفِ رہزن زمیں بھی دشمن فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن تمہیں محبت سے کام لے لو

یہ کیسی منزل پہ آ گئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا تمام اپنے غلام لے لو

یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیب مزارِ اقدس پہ جا کے ایک دن
سناؤں ان کو میں حالِ دل کا کہوں میں ان سے سلام لے لو۔

خبر نامہ ... دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

● ۱۶/ اگست ۱۹۹۸ء جامعہ ہذا میں طلبہ کی انجمن "الفلاح" کے زیر اہتمام ششماہی پروگرام کے ضمن میں تقریری ، تحریری انعامی مقابلہ منعقد ہوا جس میں کثیر تعداد میں طلبہ نے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کی ، تقریری مقابلہ میں شعبہ عربی سے ۲۸ اور شعبہ تحفیظ القرآن سے ۸ طلبہ نے اور تحریری مقابلہ میں ۱۵ طلبہ نے حصہ لیا تقریر کیلئے "امن عالم اور اسلام" اور "اسلام میں تعلیم وتبلیغ کی اہمیت" کا عنوان مقرر کیا گیا تھا ۔ جبکہ مقالہ کیلئے "تدوین حدیث ... عہد بہ عہد" اور تذکرہ امام شافعی جیسے علمی اور تاریخی موضوعات کا انتخاب کیا گیا تھا ، شعبہ تحفیظ القرآن کے طلبہ کیلئے کسی عنوان کی قید نہیں تھی ، اس موقعہ سے عربی زبان میں ۶ طلبہ نے تقریریں کیں ، طلبہ نے موجودہ زمانے کے سب سے اہم سماجی مسئلہ "اسلام اور جہیز" کے عنوان سے مؤثر اور بصیرت افروز مکالمہ پیش کیا جو کافی پسند کیا گیا آخر میں صدر جلسہ حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی اور دوسرے اساتذہ کے ہاتھوں درجہ ذیل طلبہ کو کتابوں کی صورت میں انعامات دئے گئے ۔

تقریری گروپ ۔ پنجم عربی تا دورہ حدیث

انعام اول	محمد مطیع الرحمن	ہفتم عربی
انعام دوم	محمد عمران	پنجم عربی
انعام سوم	محمد شاہد	ششم
انعام سوم	مقیم الدین	پنجم عربی

تحریری گروپ پنجم عربی تا دورہ حدیث

انعام اول	عمر عابدین	ہفتم عربی
انعام دوم	فیروز احمد	دورہ حدیث
انعام سوم	ابرار الحق	دورہ حدیث

تقریری گروپ اول عربی تا چہارم عربی

انعام اول	منظور عالم	چہارم عربی
انعام دوم	شفیع اللہ	اول عربی
انعام سوم	محمد ساجد	سوم عربی

تحریری گروپ۔ اول عربی تا چہارم عربی

انعام اول	سید امجد محی الدین	سوم عربی
انعام دوم	محمد اعظم	چہارم عربی
انعام سوم	کبیر احمد	چہارم عربی

عربی تقریر

انعام اول	عبدالعزیز	ہفتم عربی
انعام دوم	آصف الدین	پنجم عربی
انعام سوم	مظہر الدین شمشیری	ہفتم عربی

تحفیظ القرآن۔ تقریر

انعام اول	سرور حامد
انعام دوم	احمد علی
انعام سوم	محمد رضوان

پروگرام کے اختتام پر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس جامعہ ہذا اور دوسرے اساتذہ جامعہ نے طلبہ سے خطاب کیا اور صدر جلسہ حضرت ناظم صاحب مدظلہ کے خطاب کے بعد حضرت مولانا محمد برکت اللہ قاسمی صاحب استاذ حدیث جامعہ ہذا کی دعا پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

● ۱۶/اگست ۱۹۹۸ء کو امتحان ششماہی کے نتائج کا اعلان کیا گیا اور درجہ ذیل طلبہ کو امتیازی نمبرات سے کامیاب ہونے پر قیمتی کتابیں انعام میں دی گئیں۔

شعبہ عربی میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ

انعام اول	حافظ رضی الاسلام	اول عربی
انعام دوم	شجاع الدین	اول عربی
انعام سوم	حافظ شکیل احمد	دوم عربی
انعام سوم	حافظ عبدالمتین	اول عربی

شعبہ تحفیظ القرآن میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ

انعام اول	حافظ محمد تبریز

انعام دوم — حافظ محمد رضوان

انعام سوم — حافظ عطاء اللہ

روضۃ الاطفال میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ۔

انعام اول — ابو بکر بن دردم

انعام دوم — محمد خلیل

انعام سوم — محمد حاجی

● ستمبر کے آخر میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب صدر مدرس جامعہ ہذا نے اسلامک فقہ اکیڈمی کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے دہلی کا سفر کیا، حضرت مولانا اکیڈمی کے رکن تاسیسی ہیں، اس سفر میں جامعہ ہذا کے سرپرست حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کی بھی عیادت کی جو آجکل علیل ہیں اور دہلی میں زیر علاج ہیں۔

● جامعہ ہذا میں دعوت و تبلیغ کی نسبت سے متعدد علماء اور مہمانان کرام تشریف لائے۔ مولانا معین الدین قاسمی کی معیت میں علما کا ایک وفد بیڑ (مہاراشٹرا) سے آیا تھا ان حضرات نے طلبہ کے پروگرام میں بھی شرکت کی اور مولانا موصوف نے طلبہ سے خطاب بھی کیا۔

● حضرت ناظم صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد برکت اللہ قاسمی، حضرت صدر مدرس صاحب، مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی صاحب اور جامعہ ہذا کے دوسرے اساتذہ کے خطابات بھی شہر اور اضلاع کے مختلف دینی و علمی اجتماعات میں ہوئے۔

● اکتوبر کے آخر میں حضرت صدر مدرس صاحب مدظلہ نے پٹنہ (بہار) کا سفر کیا اور بہار واڑیسہ کے امیر شریف سادس کے انتخاب میں شرکت کی الحمد للہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم نائب امیر شریعت ہی متفقہ طور پر امیر شریعت سادس منتخب ہوئے، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جو وہاں کے مسلمانوں کی دینی و ملی قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اپنی دینی، ملی اور رفاہی خدمات کی وجہ سے پورے ملک میں اہل علم، علماء اور عوام کی نگاہوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور بلاشبہ اس کی ایک تابناک تاریخ ہے، دعا ہیکہ اللہ تعالی اس دینی و ملی ادارہ کو ہر قسم کے شرور و فتن سے محفوظ رکھے اور اسکی خدمات کو مزید وسعت عطا فرمائے۔ آمین ... اسی سفر میں حضرت صدر مدرس صاحب نے لکھنو کا بھی سفر کیا، چونکہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں آئندہ "اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا" کا اجلاس طے پایا ہے، آپ نے اسکے انتظام وانصرام کے سلسلہ میں وہاں کے ذمہ داروں سے ملاقات کی اور میٹنگ میں شرکت کی۔

● اب جب کہ سال ختم ہونے کو ہے امتحان سالانہ اور تقریب ختم بخاری شریف کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے، اس سال ختم بخاری شریف کیلئے ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دار العلوم

وقف دیوبند و صاحبزادہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کو بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا ہے ۔ مولانا موصوف ہی اس سال بخاری شریف کی آخری حدیث نیز جلالین شریف کی آخری سطور کا درس دیں گے ۔ ختم بخاری شریف کی تقریب مورخہ ۲۸ / رجب مطابق ۱۹ / نومبر ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوگی ۔ اور جامعہ اور اس کی شاخوں میں مورخہ ۶ / شعبان تا ۱۱ / شعبان ۱۴۱۹ھ مطابق ۲۶ / نومبر تا یکم ڈسمبر ۱۹۹۸ء امتحان سالانہ منعقد ہو گا اور ۱۶ / شعبان ۱۴۱۹ھ تا ۱۰ / شوال المکرم بسلسلہ رمضان المبارک و عیدُ الفطر تعطیل کلاں ہوگی ۔ اور انشاء اللہ ۱۱ / شوال سے دوبارہ جامعہ کھل جائے گا ۔

● مؤرخہ ۲۳ / اگسٹ جمعہ کو اردو ہال حمایت نگر میں "رؤیت ہلال" کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ منعقد ہوا ۔ مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ (ناظم) نے داعیان مذاکرہ کی دعوت پر شرکت کی اور رویت ہلال کے شرعی و فقہی نقطہ نظر کی وضاحت فرمائی ۔ اس مذاکرہ میں شہر کی مختلف عصری جامعات کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس موجود تھے ، جامعہ ہذا سے مولوی محمد عبد المنان صدیقی سبیلی اور مولانا محمد یوسف جاوید مظاہری بھی شریک ہوئے ۔

● مؤرخہ ۱۷ / جولائی جمعہ کو جامع مسجد محی الدین و ستھلی پورم میں جلسہ سیرت رحمۃ للعالمین سے مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ (ناظم) نے صدارتی خطاب فرمایا ۔ اور سیرت نبویؐ کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ۔ اس جلسہ سے مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی اور مولانا محمد عبد المنان صدیقی نے بھی خطاب کیا ۔

● مؤرخہ ۲۴ / اکٹوبر کو مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی (استاذ جامعہ) نے مدرسہ کاشف العلوم شالی کی دعوت پر جامع مسجد شالی (ضلع گنٹور) میں جلسہ اصلاح معاشرہ سے خطاب کیا ۔ داعی جلسہ مولانا مفتی محمد تاج الدین خان سبیلی تھے ، جو جامعہ کے فاضل اور متخصص فی الفقہ ہیں ۔

دعوت نامہ

مکرمی و محترمی

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ہم آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس کر رہے ہیں کہ جنوبی ہند کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم سبیل السّلام حیدرآباد میں انشاءاللہ ۲۸ رجب المرجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۹۹۸ء جمعرات کو صبح ساڑھے نو بجے (۹½) اختتامِ درس بخاری شریف کا گیارھواں جلسہ منعقد ہوگا، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظمِ جامعہ جلسہ کی صدارت کریں گے، اور ملک کے مشہور صاحبِ علم اور معروف و ممتاز عالم و خطیب ——

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند (صاحبزادہ محترم حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند) اس اہم اور مقدس جلسہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرما کر بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیں گے، اس درس سے قبل تفسیرِ قرآنِ کریم کی مشہور کتاب "جلالین شریف" کا بھی اختتامی سبق ہوگا۔

دارالعلوم سبیل السّلام سے لگاؤ اور علمِ دین سے تعلق کی بنیاد پر یہ اطلاع بھی آپ کے لئے فرحت بخش اور مسرّت افزا ہوگی کہ اس سال الحمدللہ ۵ طلبہ نے شعبۂ تخصص فی الفقہ، ۱۱ طلبہ نے دورۂ حدیث اور ۲۲ طلبہ نے حفظِ قرآن مجید کی تکمیل کی ہے، چنانچہ اس موقع سے ان تکمیل کرنے والے طلبہ کی بھی تکمیلی تقریب منعقد ہوگی، جامعہ ہذا کے موقر اساتذہ اور شہر، ریاست اور بیرونِ ریاست کے معزز علماء کا خطاب بھی ہوگا۔

آپ سے اس مبارک و مسعود جلسہ میں اپنے احباب و رفقاء کے ساتھ شرکت کی خواہش ہے۔

والسّلام

خالد سیف اللہ رحمانی

(صدر مدرس دارالعلوم سبیل السّلام حیدرآباد)

المنتظرین:

منتظمین، اساتذہ و کارکنان جامعہ

تعلیمی سال: شوال ۱۴۱۸ھ تا شعبان ۱۴۱۹ھ

تکمیل کرنے اور فراغت حاصل کرنے والے علماء، فضلاء، متخصصین فی الفقہ و مفتیان

اسماء فارغین: تخصص فی الفقہ والافتاء

١ مولوی محمد عمر بن یوسف فلاحی
٢ „ محمد ابرار الحق صدیقی قاسمی ولد عرفان الحق قاسمی
٣ „ عبدالفتاح عادل سبیلی ولد عبدالاحد
٤ „ فضل الرحمٰن قاسمی ولد مولوی محمد یعقوب
٥ „ محمد عاصم مظاہری ولد مولانا شمس الہدیٰ قاسمی

اسماء فارغین دورہ حدیث [عالمیت، فاضل]

١ مولوی ابرار الحق سبیلی ولد سید آل علی اختر

٢	„ حیدر علی	„	محمد حسین	صاحب
٣	„ نصیر عالم	„	مولوی نور عالم بیگ	„
٤	„ شمشاد عالم	„	„ „ „ „	„
٥	„ زاہد حسین	„	شفیق احمد	„
٦	„ محمد رضوان	„	سمیع احمد	„
٧	„ فیروز عالم	„	شوکت علی	„
٨	„ شمشیر عالم	„	محمد سعید	„
٩	„ محمد حسن	„	محمد عثمان	„
١٠	„ علی اکبر	„	محمد فخیر علی	„
١١	„ تبریز الدین	„	تیسیر الدین	„
١٢	„ محمد جاوید	„	حاجی محمد عثمان	„

حفظ قرآن کی تکمیل کرنے والے حفاظ

(تعلیمی سال: شوال ۱۴۱۸ھ تا شعبان ۱۴۱۹ھ)

۱	حافظ محمد اکبر	ولد	نصیر احمد	صاحب
۲	" امتیاز احمد	"	ظفیر احمد	"
۳	" افروز عالم	"	محمد قاسم	"
۴	" محمد مناظر حسین	"	محمد شفیق	"
۵	" محفوظ عالم	"	عطاء الرحمٰن	"
۶	" خلیل احمد	"	معین الدین	"
۷	" محمد شاہد	"	محی الدین	"
۸	" افتخار احمد	"	خواجہ معین الدین	"
۹	" شمشاد علی	"	صدر الحق	"
۱۰	" محمد انور	"	محمد یعقوب	"
۱۱	" عبد القدیر	"	عبد السلام	"
۱۲	" عبد السبحان	"	محمد حنیف	"
۱۳	" نعیم الدین	"	محمد عثمان	"
۱۴	" محمد خواجہ معین الدین	"	محمد قمر الدین	"
۱۵	" محمد قاسم	"	عبد الرزاق	"
۱۶	" محمد نصیر الدین	"	محمد امیر الدین	"
۱۷	" محمد آفتاب عالم	"	محمد نبی جان	"
۱۸	" عبد اللطیف	"	جمال الدین	"
۱۹	" محمد مقصود	"	حمدان یمانی	"
۲۰	" محمد سلطان	"	محمد قاسم	"
۲۱	" محمد آصف	"	محمد یوسف	"
۲۲	" احمد بن علی نہدی			

جامعہ اسلامیہ دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

الحاد و بے دینی اور مذہب بیزاری کی موجودہ فضا، اخلاقی اور دینی قدروں کیلئے سخت خطرہ بن گئی ہے، پھر ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کا نظامِ حکومت سیکولر ہے اور نظامِ تعلیم پر مذہب کی گرفت کمزور ہو جانے کی وجہ سے دین کی حفاظت اور آئندہ نسلوں کا دین سے رشتہ باقی رکھنا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے، ایسا مسئلہ کہ اس پر مسلمانوں کا مذہبی تشخص، تہذیبی یکتائی، ملّی وجود اور اسلام سے ان کا تعلق اور رشتہ موقوف ہے، دینی مدارس و مکاتب کے قیام کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے نہ صرف باقی بلکہ مضبوط و مستحکم رہے، مسلمانوں کے ساتھ دین کا تعلق باقی رکھنے اور ہر زمانہ میں دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں اور تحریکات کے سدّباب میں مدارس نے جو خدمات انجام دی ہیں، برصغیر پاک و ہند کی گذشتہ صدی کی تاریخ کا ورق ورق اس پر شاہدِ عدل ہے، ایسے ہی اداروں میں ایک اہم ادارہ **جامعہ اسلامیہ دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد** ہے جو گذشتہ ۲۶ برسوں سے اشاعتِ علم اور حفاظتِ دین کی خدمت میں مصروف ہے، بنیادی دینی تعلیم سے لے کر دورۂ حدیث شریف (فضیلت) اور فقہ و افتاء اور دعوتِ اسلامی میں اختصاص تک تعلیم کا نظام ہے، جامعہ کے دارالاقامہ میں (۵۴۸) طلبہ مقیم ہیں، جن میں اکثر غریب و نادار طلبہ ہیں، ان کی جملہ ضروریات کی تکمیل جامعہ کی طرف سے ہوتی ہے، شہر و اضلاع میں ۲۵ شاخیں کام کر رہی ہیں، جن سے تقریباً تین ہزار طلبہ استفادہ کر رہے ہیں، جامعہ کے سالانہ اخراجات تقریباً ۵۸ لاکھ روپے (علاوہ تعمیرات) ہیں، اخراجات کی تکمیل صرف اصحابِ خیر اور مخلص مسلمانوں کے تعاون سے ہوتی ہے، کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔

جامعہ میں اس وقت تحفیظ القرآن کی عمارت کے دو حصوں کا کام زیرِ تعمیر ہے، اسی طرح جامعہ کی وسیع مسجد، جس کی ایک اچھے نقشے کے ساتھ تعمیر مکمل ہو چکی ہے، کے سامنے ایک پلیٹ فارم (جس کے نیچے ایک ہمہ مقصدی ہال ہوگا) کا کام باقی ہے، نیز مقیم طلبہ کیلئے ہاسٹل (دارالاقامہ) اساتذہ کے لئے

فیملی کوارٹرس اور مہمان خانہ بھی جامعہ کی اہم ضروریات میں سے ہیں، ان تعمیری ضروریات کے لئے اصحابِ خیر کی توجہ کی ضرورت ہے۔

جامعہ سے اَب تک، ۲۴۳ طلبہ حفظِ قرآن، ۴۲،۱۲ طلبہ عالمیت، ۵۷،۱ طلبہ فضیلت (دورۂ حدیث)، ۷،۵ طلبہ افتاء کی تعلیم مکمل کرچکے ہیں، مختصر مدتی کورس کے ذریعہ تعلیم مکمل کرنے والے ۸۴ فضلاء ہیں، تربیتِ دعوت میں ۲۸، تربیتِ امامت میں ۴۶ اور بنیادی دینی تعلیم سے استفادہ کرنے والے ۲۲۳۵ طلبہ ہیں اور یہ سب فضلاء و فارغین مختلف علاقوں میں دینی و دعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بحمداللہ جامعہ میں ہر سال تیس پینتیس طلبہ حافظِ قرآن ہوتے ہیں، حفظِ قرآن کی عظمت اور اس کی سعادت و برکت سے ہر مسلمان بخوبی واقف ہے۔ حفظ قرآن کے لئے عام طور پر چار سال اور عالمِ دین بننے کے لئے آٹھ سال کی مدت ہوتی ہے، آپ اپنے یا اپنے والدین کے "صدقۂ جاریہ" کے لئے یا وفات پائے ہوئے کسی عزیز و قریب کے "ایصالِ ثواب" کے لئے ایک یا اس سے زائد طلبہ کی کفالت قبول کرلیں تو یہ باعثِ سعادت و نجات ہوگا۔ واضح ہو کہ ایک طالبِ علم کا ماہانہ خرچ چار سو روپے ہے۔

اس موقع پر ان مسلمان بھائیوں جو دین کی حفاظت و صیانت کی تڑپ رکھتے ہوں، اسلام کی سربلندی جن کو عزیز ہو اور جو اپنے مال و جان میں اللہ اور اس کے رسول کا حق باور کرتے ہیں، گذارش ہے کہ زکوٰۃ، صدقات، عطیات، چرمِ قربانی، ماہانہ اور سالانہ چندہ کے ذریعہ اس ادارہ کا بھرپور، فراخدلانہ اور مخلصانہ تعاون فرماکر عنداللہ ماجور ہوں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

For Cheque and Drafts
DARULULOOM SABEELUSSALAM
A/c SB C&I 01100005117
SBI KING KOTHI BRANCH, HYDERABAD

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

ایک نظر میں

بانی وناظم : مولانا محمد رضوان القاسمی

○ تعدادِ طلبہ (۶۸۳) ○ مقیم طلباء (۵۴۸) ○ اساتذہ ۳۱، دیگر عملہ ۲۷، سفراء مبلغین ۷۔

شاخیں ــــ ۲۵، ۴ اقامتی، ۲۱ غیر اقامتی ــــ شاخوں میں مقیم طلبہ کی تعداد تقریباً (۳۰۰)

تعلیمی شعبہ جات

تخصص فی الفقہ، تخصص فی الدعوۃ، تخصص فی الادب، اردو اسلامیات کورس، عربی شعبے، عالمیت وفضیلت، مختصر مدتی عالم کورس (برائے طلبہ عصری مدارس) تحفیظ القرآن، روضۃ الاطفال، شعبۂ تجوید، تدریب الائمہ۔

دیگر شعبہ جات

دارالافتاء، کتب خانہ، دارالاقامہ، تعمیرات، طلباء کی انجمن "الفلاح"، دارالاشاعت، دارالمطالعہ، کمپیوٹر، شفاخانہ ودیگر فنی شعبہ جات (۷)۔

جرائد : ــــ سہ ماہی صفا (اردو) سہ ماہی صوت السلام (عربی) سالنامہ معمار (طلبہ)

تعلیمی سال : ــــ شوال تا شعبان ○ مالی سال : ــــ شعبان تا رجب۔

سالانہ اخراجات : ــــ (۵۸½) لاکھ روپے (علاوہ تعمیرات) ○ سالِ آئندہ کا تخمینہ : ۶۵ لاکھ روپے۔

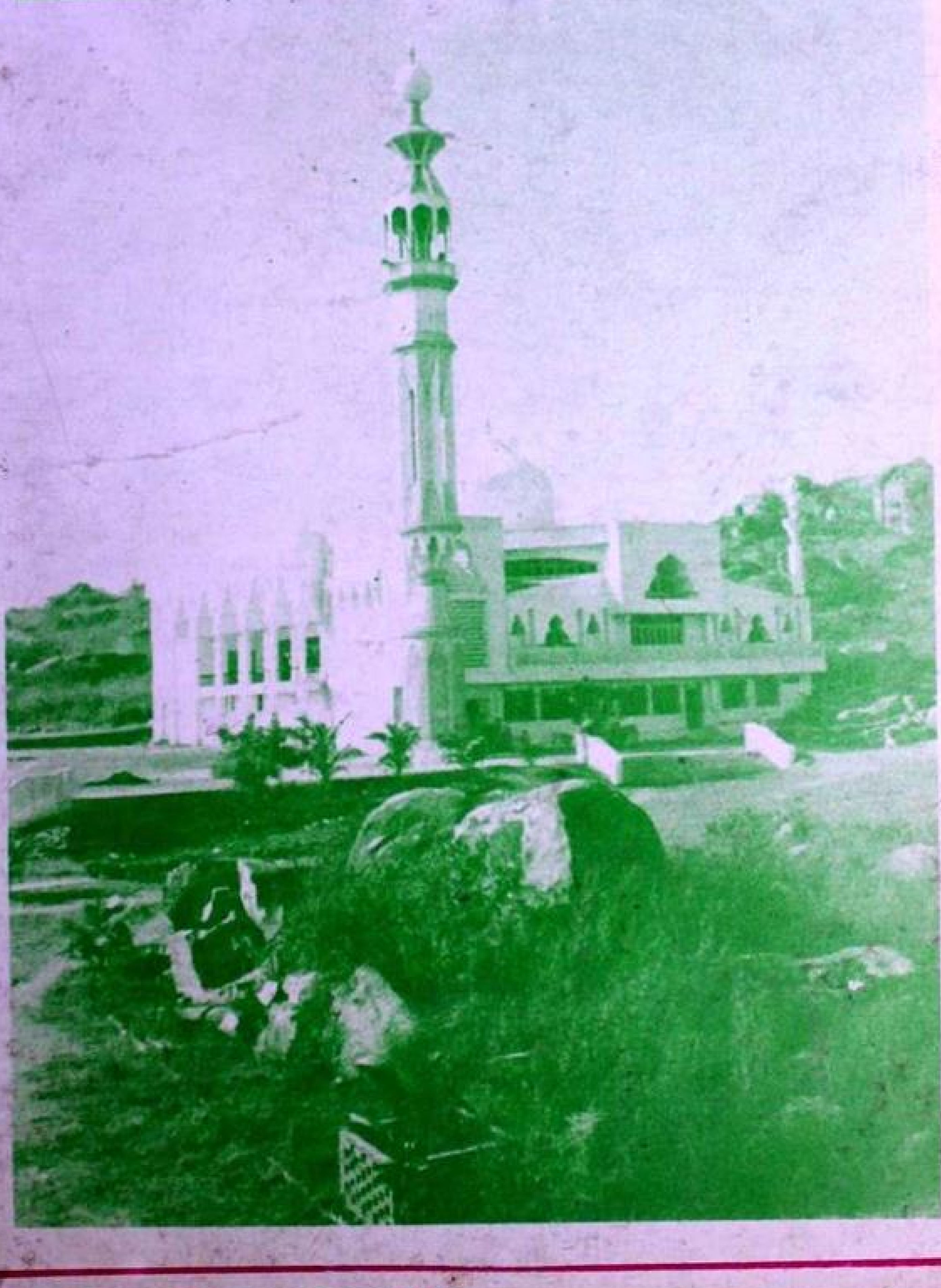
ذرائع آمدنی : ــــ (صرف عام مسلمانوں کا تعاون)

شائع کردہ : شعبۂ نشر واشاعت دارالعلوم سبیل السلام، عقب صلالہ، بارکس، حیدرآباد ۵

JAMIA ISLAMIA
DARULULOOM SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar (Behind Salala, Barkas)
Hyderabad - 500 005 (A.P.) INDIA.
Phone : 4440450 FAX 0091-40-3203668

SAFA صفا

جامع عمر بن الخطابؓ
دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد



DARUL-ULOOM SABEEL USSALAM
PO. BALAPUR
BARKAS HYDERABAD -500 005. A.P. INDIA

Tel : (040) 4440450
Fax : (040) 3203668